میرے اساتذہ، میری درسگاہیں

درخشاں ستارے

تالیف

محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث وادب دارالعلوم وقف دیوبند

مکتبۃ النور دیوبند

میرے اساتذہ، میری درسگاہیں

درخشاں ستارے

تالیف

محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث و ادب دار العلوم وقف دیوبند

ناشر

مکتبۃ النور دیوبند

نام کتاب : میرے اساتذہ میری درسگاہیں، درخشاں ستارے

مصنّف : (مولانا) محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث وادب دار العلوم وقف دیوبند

صفحات : ۱۸۴

تعداد : ۶۰۰

اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۹ء

فہرست

دارالعلوم دیوبند ۵۵

شعبۂ کتابت اور اساتذہ ۱۳۳

مُقدّمہ

''میرے اساتذہ، درخشاں ستارے'' ان باکمال اور یگانۂ روزگار شخصیات کی سوانح حیات نہیں ہے جن سے میں نے علمی استفادہ کیا بلکہ یہ ایک علمی سفرنامہ ہے جس میں ابتدائی تعلیم سے اب تک کے علمی سفر میں جو پڑاؤ آئے - ابھی منزل دور ہے - ان کا ذکر بطورِ درس وعبرت ہے، یہ تأثراتی مضامین کا ایک سلسلہ ہے، اساتذۂ کرام کے جملہ اوصاف، سوانحی تذکرے یا خدمات وکارناموں کا مکمل احاطہ قطعی نہیں۔

ان حضرات سے علمی انتساب اوران کے علوم وفیوض سے استفادہ میرے لیے باعث فخر وسعادت ہے، جس کا اظہار تحدیث نعمت کے طور پر اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔

ایک پسماندہ علاقہ، بدعات و جہالت سے لبریز خطہ، اولیاء و پیرانِ طریقت کے نقوش وتجلیات سے دور، ملّی جماعتوں اور تنظیموں کی خدمات وتوجہات سے محروم سرزمین اوران پڑھ خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مایہ فرد کو دینی علوم سے آگہی کے لیے جن مخلص علماءِ دین وباکمال شخصیات سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا ان کی بارگاہ میں یہ مجموعہ خراجِ تحسین نہیں بلکہ اظہار عقیدت کا ایک معمولی ذریعہ ہے۔

طالب علمی کی زندگی کسی بھی شخصیت کے رتبہ وکمال، ان کے عروجِ علمی یا خدمات کے شعور سے عام طور پر بے نیاز رہتی ہے اوران کی قدرومنزلت سے ناآشنا بھی رہتی ہے، اس لیے ان سے کما حقہ استفادے کا موقع بھی میسر نہیں آتا، بسااوقات طالب علم بعض اساتذہ سے حصولِ علم بھی ایک نصابی مجبوری تصور کرتا ہے،

یا سرپرستوں کی بے جا تاکید، مگر جب وہ شعور کی منزلیں طے کرتا ہے اور خدا کی توفیق شامل ہوتی ہے تو گذرے وقت کے ساتھ ساتھ احساس زیاں بھی کرتا ہے، پھر جب ان مشفق و مربی اساتذہ کی قدرو منزلت کی پہچان ہوتی ہے تو دل عقیدت سے معمور ہوجاتا ہے۔ ان عقیدتوں کے احساسات پر مشتمل یہ تحریر ہے، جس میں ابتدائی مکتبی تعلیم کے استاذ اور تعلیم کے دیگر مرحلوں کے اساتذہ حضرات کے تذکرے ہیں، ان کی زندگی کے جملہ گوشوں یا خدمات کا ذکر مقصود نہیں، بلکہ دورانِ تلمذ، ان حضرات کے طرزِ تدریس، تقویٰ، تربیت اور اثر پذیری کی جو خاصیتیں ایک طالب علم نے محسوس کیں وہ قلم بند ہیں، ضمناً بعض اساتذہ و مشائخ کے علمی کارناموں کا مختصر تذکرہ بھی ہوسکتا ہے۔ ابتدا میں ان مقامات یا درسگاہوں کا اجمالی بیان بھی ہے، جہاں سے علم دین لکھنے پڑھنے کا سلیقہ نیز توفیق الٰہی کا حصول ہوا۔

اپنے اساتذہ پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں علامۂ دوراں، ماہرفن اور یکتائے روزگار افراد پاتا ہوں، جن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے اور فیض حاصل کرنے کا حوالہ ہی میرے لیے باعث فخر بن جاتا ہے اور اپنی کم علمی و بے مایگی کا احساس کم ہوجاتا ہے۔

دیوبند کے سند حدیث شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد رشید محدث زمانہ حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ سے بخاری شریف کا درس حاصل کیا، امام النحو علامہ صدیق کشمیریؒ سے شرح جامی پڑھنے کا موقع ملا، اور عربی کے شیخ الادب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ سے عربی زبان و ادب کا شعور ملا، جو اَب بھی میری امتیازی شناخت کا عنوان ہے، ترجمان مسلکِ دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے درس وافادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہوا اور عالم عرب کے معروف محدث و فقیہ ومصنّف شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے علمی استفادہ اور سند حدیث باعث افتخار، یہ

وہ حضرات ہیں جن کی شاگردی میرے لیے توفیق خداوندی کے سوا کچھ بھی نہیں۔
اس مجموعے میں بعض ان اساتذہ کا تذکرہ نہیں ہے جن سے ابتدائی سالوں میں رمضان کی تعطیلات میں ہندی، حساب اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم پائی ہے، نہ ان اساتذہ کا ذکر جن سے پرائمری درجہ سے بی اے تک انگلش کی کتابیں پڑھیں۔
دراصل دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کی تکمیل (۱۹۷۱ء) کے بعد تکمیل ادب عربی، عربی و اردو خوش نویسی اور دارالافتاء کے شعبے سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں ملازمت کا موقع مل گیا، ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے پندرہ روزہ عربی رسالے "**الداعی**" کا اجراء ہوا، اس کی ادارت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے سپرد تھی، انھوں نے دو معاون طلب کئے، دوسرے معاون کے طور پر میرا تقرر ہوا اور یہ ملازمت ۱۹۸۲ء تک جاری رہی۔ دارالعلوم میں ہنگامے اور قضیۂ نامرضیہ کی وجہ سے میں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کے ساتھ وقف دارالعلوم دیوبند سے وابستگی اختیار کرلی تھی جو اب تک قائم ہے۔
"**الداعی**" میں ملازمت کے دوران ہی انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا، اور بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہائی اسکول اور پری یونیورسٹی کے انگلش امتحانات دے کر کامیابی حاصل کی، بی اے کی تعلیم تو مکمل ہوگئی مگر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند منعقدہ ۱۹۸۰ء کی مشغولیات کی وجہ سے آخری امتحان میں شرکت نہیں ہوسکی۔ پھر دس سال کے بعد ۱۹۹۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی تکمیل کی، مگر ان علوم وفنون اور اساتذہ کا یہاں ذکر نہیں ہے۔
صرف دینی علوم کے مراکز یا شیوخ واساتذہ کے واقعات وحالات ذکر کررہا ہوں، ان سے ہی مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند وقف میں

گذشتہ ۳۵ سے زائد سالوں سے درس وتدریس کی خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہے، اور میری خوش نصیبی ہے کہ اس درسگاہ میں ادب وفقہ واصول کی کتابوں کے علاوہ دورۂ حدیث کی تقریباً تمام کتابیں پڑھانے کا موقع ملا، بشمول مسلم شریف (۲۰ سالوں سے) اور بخاری شریف جلد اوّل کے چند پارے۔

دارالعلوم دیوبند سے ہی ۱۹۷۶ء سے عربی زبان وادب کی تدریس وتمرین اور وقف دارالعلوم میں ۳۵ سالوں سے قسم الادب العربی کی نگرانی وتعلیم سے بھی وابستہ ہوں، دارالافتاء کے بعض اسباق بھی مجھ سے متعلق رہے، بلاشبہ یہ سعادتیں اور کامرانیاں میرے ان اساتذہ ہی کے طفیل ہیں جو شاہانِ علوم دینیہ ہیں اور جن کے انتساب سے ہی ایک ذرے کو ان درخشاں ستاروں کی چمک حاصل ہوگئی، جو بقول شاعر:

"بنے ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا"

اور جن نابغۂ روزگار مشائخ حدیث، علمائے دین اور ماہرین زبان وادب کے بارے میں فخریہ کہہ سکتا ہوں:

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم

اذا جمعتنا یا جریر المجامع

اللہ رب العزت ان حضرات کے درجات بلند فرمائے اور ان کی علمی خدمات کا فیض جاری رکھے۔ آمین

محمد اسلام قاسمی

۱۳ ؍رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

مکتب:

حاجی مولوی محمد لقمان صاحبؒ

تعلیم یافتہ، مہذب مسلم گھرانوں میں بچوں کی تعلیم کی ابتدا باضابطہ تقریب سے ہوتی ہے، بسم اللہ کی رسم تاریخی شخصیات کی سوانح حیات میں عام طور پر مذکور ہوتی ہے، کسی بزرگ عالم دین سے بسم اللہ کرائی جاتی ہے اور دعا کے ساتھ تعلیم کا آغاز ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر کوئی خاندان اَن پڑھ ہو اور کسی نے اسکول، مدرسہ یا کسی مولوی صاحب سے کچھ نہ پڑھا ہو وہاں اگر کسی بچے کو پڑھنے کے لیے ترغیب دے کر مولوی صاحب یا ماسٹر صاحب کے پاس بٹھا دیا جائے گو کہ یہ طریقہ بھی رسم بسم اللہ سے مشابہ ہے پھر بھی اسے کسی تقریب یا اہمیت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ میری تعلیمی ابتدا بھی مؤخر الذکر طریقے سے ہوئی، میرے خاندان میں میرے دادا مرحوم کے ایک بھتیجے نے اتنا پڑھ لیا تھا کہ وہ اٹک اٹک کر قرآن شریف پڑھ لیا کرتے تھے، ان کے علاوہ سب لکھنے، پڑھنے سے ناآشنا تھے، اسی لیے جب میری عمر چار، پانچ سال کی ہوئی تو گھر والوں نے بچے کو اپنی ضرورت اور فہم کے مطابق گھر کی بکریوں کو چرانے کی تربیت دینے کی کوشش شروع کر دی، مگر اللہ مسبّب الاسباب ہے، مقلب القلوب ہے، میری والدہ نے کہہ دیا کہ میرا بیٹا تعلیم حاصل کرے گا - نقار خانے میں طوطی کی آواز - اس "عظیم خاتون" کی اس بات کا مذاق اڑایا گیا، آخر بچہ پڑھے گا کہاں؟ اور کس سے؟ گاؤں میں نہ کوئی اسکول، نہ مکتب اور نہ پکی مسجد میں متعین امام صاحب!!

جذبہ، خلوص اور لگن ہو تو منزل کے لیے راہیں مل جاتی ہیں، والدہ محترمہ نے گھر والوں کے علی الرغم مجھے آبائی وطن سے تقریباً بیس کیلومیٹر دور میری نانی کے پاس اس تاکید کے ساتھ چھوڑ دیا کہ اس کو اسکول بھیجنا ہے۔

نانیہال کے اس گاؤں (موضع بھٹرا ضلع دمکا، بہار-اب ضلع جامتاڑا، جھارکھنڈ-) میں خالص مسلم آبادی ہے، اور علاقے کی بہت بڑی بستی شمار کی جاتی رہی ہے، مگر ہندوستان کی آزادی کو دس، بارہ سال ہو چکے تھے اور ابھی کوئی سرکاری اسکول ابتدائی پرائمری تعلیم کے لیے بھی قائم نہیں ہوا تھا، تجویز آچکی تھی، ماسٹر کی تقرری بھی ہو چکی تھی، مگر اسکول کی عمارت ہی نہیں تھی۔ قریب تین کیلومیٹر دور ایک بہت چھوٹا گاؤں غیر مسلم آبادی پر مشتمل تھا ''رام پور'' وہاں مڈل اسکول جاری تھا، ایسے وقت میں ایک مولوی صاحب مسلمان گاؤں والوں کے اصرار پر بچوں کو دینیات پڑھانے کے لیے مقیم ہو گئے تھے، اس طرح مکتب کی ابتدا ہو گئی، اسی مکتب میں میری نانی نے مجھے ''قاعدہ بغدادی'' دے کر بٹھا دیا۔

یہ تھے میرے معلّم اوّل مولوی محمد لقمان صاحب، اور گاؤں کا یہ پہلا مکتب یا اسکول، گاؤں کی بڑی آبادی اور آس پاس کے چار پانچ گاؤں کے بچے ۲-۳ کیلومیٹر چل کر یہاں پڑھنے کے لیے آتے، مجموعی تعداد پچاس بھی نہیں تھی۔

مولوی حاجی محمد لقمان نے ابتدائی دینی تعلیم ضلع پرولیا (مغربی بنگال) کے ایک عربی مدرسے سے حاصل کی تھی، وہیں فارسی کی تعلیم مکمل کی، ابتدائی عربی کی چند کتابیں بھی پڑھیں، اس سے زیادہ کی تعلیم اس مدرسے میں بھی نہیں تھی، اس لیے گویا انھوں نے اپنی عربی دینی تعلیم مکمل کر لی تھی، اس وقت کسی بڑے ادارے کی طرف رخ کرنے کا یا تو رواج ہی نہیں تھا یا وسعت نہیں ہوتی تھی، مولوی صاحب نے مکتب شروع کر دیا، اسی میں راقم الحروف قاعدہ بغدادی، عم کا پارہ اور

اردو قاعدے پڑھ کر قرآن شریف ناظرہ کی جماعت میں شامل ہوگیا تھا، قرآن شریف مکمل ہوا، اردو کی پہلی اور دوسری کتاب ختم ہوئی، ''دینی تعلیم کا رسالہ'' کے چند حصے ختم کئے، اب درجۂ فارسی میں داخلے کا وقت تھا۔

واضح رہے کہ اس پورے خطے میں تقریباً سو کیلومیٹر کے رقبے میں کوئی دینی مدرسہ نہیں تھا، ضلع ہزاریباغ کے ایک شہر گریڈیہہ (اب ضلع) میں ''جامعہ حسینیہ'' نام کا ایک مدرسہ جاری تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب سنتھال پرگنہ (جس کے چھ ضلع بن چکے ہیں) میں باضابطہ حفظ قرآن کا کہیں کوئی انتظام نہیں تھا، اس لیے ناظرہ قرآن شریف اور اردو کے بعد فارسی کی کتابیں ہی پڑھائی جاتی تھیں۔

گاؤں میں اب سرکاری اسکول جاری ہو چکا تھا، اس لیے مولوی لقمان کی جانب لوگوں کی توجہ کم ہوگئی، غریب اور پسماندہ گاؤں والوں کو ہر ماہ چند روپے کی شکل میں تنخواہ جو دینی پڑتی تھی، ابھی ان میں تعلیم اور خاص طور پر دینی تعلیم کی اہمیت کا کوئی احساس ہی نہیں تھا، ہماری مسلم قوم کی بے حسی، لاپرواہی، دنیا داری اور دینی علوم سے غفلت کا مزاج آج بھی وہی ہے جو آزادی کے بعد تھا، اُس وقت ان کی مالی پریشانی ایک عنوان بن جایا کرتی تھی، اب مالی وسعت اور تعلیم کی اہمیت وافادیت سے آگہی کے باوجود مزاج میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔

مولوی لقمان صاحب نے گاؤں چھوڑ دیا، تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک مسلم آبادی موضع الگ چُواں ہے وہاں وہ معلّم مقرر ہوگئے، پرانے مکتب کے چند طلبہ جو قرآن شریف ختم کر چکے تھے اور فارسی جماعت میں پڑھنا چاہ رہے تھے وہ اپنے استاذ کے ہمراہ نئے مکتب میں آگئے، چنانچہ ہم چند افراد روزانہ دونوں وقت اپنے گھروں سے پیدل چل کر مکتب جایا کرتے تھے اور سبق میں حاضر ہوتے تھے۔

مولوی محمد لقمان صاحب کی فارسی بہت عمدہ تھی، بلاشبہ وہ فارسی میں گفتگو پر قادر

تھے، فارسی کی پہلی، دوسری، آمدنامہ، پندنامہ، کریما اور نسخۂ تعلیمیہ ان کو ازبر تھے، ہم بچوں کو تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان کتابوں کے حافظ ہیں، گلستاں اور بوستاں پر بھی ان کو قدرت تھی۔ البتہ چوں کہ ان کی تعلیم مغربی بنگال کے ایک مدرسے میں ہوئی تھی اور کوئی قاری یا مجوّداُن کا استاذ نہیں تھا اس لیے اردو اور عربی حروف کے مخارج سے ان کو زیادہ واقفیت نہیں تھی، بہت بعد میں جب ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد دیوبند اور سہارن پور سے عالم، فاضل بن کر آئی اور انہوں نے متوجہ کیا تو مولوی صاحب نے بمشکل تمام اپنی زبان کی اصلاح کی۔ ان سے پڑھی ہوئی فارسی کا اثر یہ تھا کہ فارسی زبان میں کوئی مضمون یا کتاب ہمیں مشکل نہیں لگی۔

مگر اس شخص نے بلکہ اس شخصیت نے علاقے کے مسلمانوں کی جو دینی ومعاشرتی اصلاح کی وہ بلاشبہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے صوبہ بہار وجھارکھنڈ کے علاوہ بنگال، یوپی، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات، آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر اور تمل ناڈو میں تعلیم وتدریس، امامت، تصنیف وتالیف اور اصلاح معاشرہ ودعوت وتبلیغ کے ذریعہ نمایاں دینی وملّی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اور تقریباً پچاس سال قبل ضلع دمکا واطراف کے علاقے میں جو بدعات ورسومات رائج رہیں، جہالت اور گمراہی کا جو دوردورہ تھا، بحمداللہ ان کی محنت، خلوص اور جدوجہد سے کافی حد تک ان کا خاتمہ ہو چکا ہے، ان کے شاگردوں نے کئی دینی مدرسے قائم اور جاری کئے، سیکڑوں قرآنی مکاتب کا اجرا کیا، جو بڑی نیک نامی اور کامیابی سے ہمکنار ہیں اور دینی، اصلاحی، دعوتی اور ملّی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حاجی محمد لقمان صاحب نے اس مکتب کی توسیع کی اور اسے مدرسے کی شکل

دی، مدرسہ کاشف العلوم الگ چواں ضلع جامتاڑا (جھارکھنڈ) کی شکل میں وہ ادارہ اب بھی قائم و سرگرم ہے، اس مدرسے میں انہوں نے اپنے لائق و باصلاحیت شاگردوں کو جو دیوبند یا سہارن پور سے فارغ التحصیل تھے تدریس میں لگایا۔ یہ مدرسہ اب مدرسہ ایجوکیشنل بورڈ سے ملحق ہے، اور وہ خود اس سے ریٹائر ہو چکے ہیں، مگر اب بھی وہ اپنے مشوروں، مواعظ اور دینی و ملّی سرگرمیوں سے مسلمانوں کو فیضیاب کر رہے ہیں۔ **فجزاہ اللہ خیر الجزاء** (آمین)

ان کے کارناموں میں سے ایک ضلع جامتاڑا کے مسلم اکثریتی بلاک نرائن پور میں جامع مسجد کا قیام ہے۔ یہاں پر رہنے اور یہاں بازار آنے والے افراد کے لیے پنج وقتہ نماز کے لیے اور خصوصی طور پر جمعہ کے لیے کوئی مسجد نہیں تھی، بمشکل تمام ایک زمین خریدی گئی اور اس پر جامع مسجد کی تعمیر بلاشبہ حضرت حاجی محمد لقمان صاحب کی جد وجہد کا ثمرہ ہے۔(۱)

(۱) مؤرخہ ۷؍جولائی ۲۰۰۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ **تغمدہ اللہ بغفرانہ**
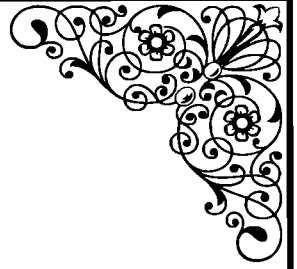
جامعہ حسینیہ گریڈیہہ

(جھارکھنڈ)

جامعہ حسینیہ گریڈیہہ (جھارکھنڈ)

ریاست بہار متحدہ کا جنوبی خطہ جو اَب صوبہ جھارکھنڈ کے نام سے جانا جاتا ہے، ساٹھ کی دہائی میں معاشی اور تعلیمی لحاظ سے بیحد پسماندہ رہا ہے جب کہ مشہور اسٹیل نگری جمشید پور اور بوکارو اسٹیل سٹی اسی کا حصہ ہیں، اور معدنیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی علاقے میں پایا جاتا ہے، جنگلات کا بھی ایک طویل سلسلہ یہاں رہا ہے، اس کے باوجود ریاستی دارالحکومت پٹنہ کی بے توجہی کا شکار اور صوبائی حکومت کی ترقیاتی توجہات سے محروم رہا ہے، اسی خطے کا ایک ضلع ہزاری باغ بھی ہوا کرتا تھا جو اپنے جنگلات اور ابرک کی فراوانی کی وجہ سے مشہور رہا ہے، اسی ضلع کا ایک مشہور قصبہ گریڈیہہ تھا، شہری علاقے کے علاوہ اطراف میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ اب اکیسویں صدی میں ضلع ہزاری باغ کئی اضلاع میں تقسیم ہو چکا ہے، سب سے پہلے گریڈیہہ ضلع بنا، پھر دوسرے اضلاع: چترا، کوڈرما اور بعض علاقے بوکارو اسٹیل سٹی میں۔

اس سرزمین پر جب شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے قدم پڑے تو ایک دینی تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں آیا جو آج بھی ''جامعہ حسینیہ گریڈیہہ'' کے نام سے موجود ہے، بانی کی توجہات اور دعاؤں سے اس ادارے نے بہت ترقی کی، اور عرصۂ دراز تک جھارکھنڈ کے چند دینی مدارس میں اس کا شمار ہوتا رہا، اس علاقے میں چند ہی مدارس تھے جہاں عربی درجات میں متوسطات تک تعلیم ہوتی تھی۔

رشید العلوم چترا اور جامعہ حسینیہ رانچی کے علاوہ کوئی قابل ذکر مدرسہ بھی نہیں تھا۔ کچھ مدارس بہار بورڈ کے تحت نیم سرکاری تھے جن کا نصاب تعلیم دینی وعصری علوم پر مشتمل ہے، مگران میں تعلیم، طریقۂ تعلیم اور انتظام وتربیت کا جو حال (پستی کی حدتک) موجودہ وقت میں ہے آج سے پچاس سال قبل بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

جامعہ حسینیہ گریڈیہہ ایک آزاد دینی مدرسہ تھا اور نیک نام بھی، اس کی علمی رفعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں جلالین شریف اور مشکوٰۃ شریف تک تعلیم ہوتی تھی، اور یہاں کے مدرسین باصلاحیت و باکمال، معروف اساتذہ میں مفتی بلال احمد وقاری شوکت (بھاگلپور کے) حضرت مولانا افتخار صاحب اعظمی، حضرت علامہ عثمان غنی (سابق شیخ الحدیث مظاہر علوم وقف سہارن پور) حضرت مولانا عبدالحق اعظمی (سابق محدث کبیر و نائب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا قاری محمد ایوب مظاہری قاضیٔ شریعت ضلع گریڈیہہ جیسے اساتذہ و اکابر علماء کی تدریسی خدمات اس ادارے کو حاصل رہی ہیں۔

اس زمانے میں جھارکھنڈ کے چند ہی اضلاع تھے، ۱-ہزاری باغ ۲-پلاموں ۳-رانچی ۴-دھنباد ۵-سنگھ بھوم (جمشید پور) اور ۶-دمکا۔ عربی درجات کی تعلیم کے لیے جامعہ حسینیہ میں ضلع دمکا، دھنباد، ہزاری باغ کے علاوہ مغربی بنگال کے طلبہ بھی داخل ہونے کے لیے آتے تھے۔

چنانچہ جب میری ابتدائی دینیات اور فارسی کے درجات کی تکمیل ہوئی تو ایک کرم فرما نے مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو اسی مدرسے میں داخلہ دلایا، عربی کی پہلی جماعت تھی، علامہ عثمان غنی مدرسہ سے رخصت ہوچکے تھے، مگر دوسرے اکابر موجود تھے اور غالباً یہ ۱۹۶۲ء کا زمانہ ہے، بچپن کی کچھ یادیں ذہن میں محفوظ ہیں، ہندوستان اور چین کی جنگ ہورہی تھی، بازار میں جنگ کے لیے عوامی چندہ اکٹھا کیا جارہا تھا، اور عام طور

پرقومی ترانہ یا حب الوطنی پر مشتمل نغمے ریڈیو پر سنائی پڑتے تھے۔

پھر چار سال تک اس ادارے میں تعلیم کے لیے مقیم رہا۔ اس دوران مختلف اساتذہ سے کتابیں پڑھیں۔ یاد ہے کہ ایک نئے فاضل دیوبند مولانا محمد عباس چتراوی سے پرائمری انگلش پڑھنے کا موقع بھی ملا تھا، ان کے بارے میں بعد میں کچھ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں، مگر اتنا اب بھی یاد ہے کہ فاضل قاسمی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی ادب سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ نفاست پسند، سلیقہ مند اور مشفق و مربی۔

مگر ان کے علاوہ وہ اساتذہ خاص طور پر یادرہے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں ملاقات سے بالمشافہ یا بالواسطہ ان سے رہنمائی حاصل ہوتی رہی، اور وہ معروف ومشہور اساتذہ، خطیب اور مصلح کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

اس دینی درسگاہ کے آخری سال ۱۹۶۵ء میں مدرسہ کی نوعیت بدل چکی تھی، اب اس کو بھی بہار مدرسہ بورڈ سے ملحق کر کے نیم سرکاری بنادیا گیا۔ پھر شروع ہوا وہ زوال جو اس طرح کے مدرسوں کے حصے میں آتا رہا ہے۔ اور اب یہ نہ دینی درسگاہ والی معروف ومقبول صورت میں ہے جہاں تعلیم کے ساتھ دینی تربیت بھی ہوتی ہے اور نہ ہی یہ عصری درسگاہ کی حکومتی رعایت میں ہے۔

قاری محمد ایوب مظاہریؒ

جامعہ حسینیہ گریڈیہہ میں عربی اوّل کی جماعت میں داخلہ ہوا، مفتی بلال احمد بھاگلپوری کے پاس ایک کتاب اور زیادہ تر کتابیں حضرت مولانا قاری محمد ایوب صاحب مظاہری سے متعلق، قاری صاحب جوان العمر فاضل مظاہر علوم سہارن پور، سانولی صورت، وجیہہ چہرہ، تنومند اور بہت ہی باوقار، لحن داؤدی کی جھلک ان کی تلاوت قرآن کا امتیازی وصف، عام طور پر جامعہ کی مسجد جو گریڈیہہ کی پرانی جامع مسجد ہے کی امامت ان سے متعلق، نماز میں قرآن کی تلاوت کا اتنا شیریں لہجہ اور تجوید کے قواعد کی پابندی جو ابتدا میں تھی اخیر عمر تک بحمد اللہ برقرار۔ اور آج پچاس سال سے زائد کا عرصہ ہو رہا ہے، ہندوستان میں راقم الحروف کو ان سے بہتر قاری و امام کوئی نظر نہیں آیا۔ کسی اجلاس، اجتماع یا مسجد میں ان کی موجودگی ہو تو درخواست کرتا کہ وہی نماز پڑھائیں، اور نماز میں اتنی طمانینت اور سکونِ قلبی کا احساس ہوتا اگر مبالغہ نہ تصور کیا جائے تو کہہ دوں کہ روح وجد کرتی۔

کتابی صلاحیت بھرپور، مگر ہمیشہ مطالعہ کرتے رہنا ان کا معمول، عربی مراجع کا مطالعہ، اخذ و استفادہ اپنی جدوجہد سے، تدریس کا انداز پر تاثیر، تفہیم کا طریقہ لائق تحسین، دورانِ درس نہایت مشفق، خوبصورت تبسم ان کے چہرے کی زینت، لیکن اوقاتِ درس کے بعد لہجہ کرخت، طلبہ کی نگرانی اور تربیت میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں، طلبہ میں ان کے لیے بیحد عزت و احترام اور ہلکا سا خوف بھی۔

ابتدائی مدرّسین کی بے جا سختی اور مرعوب کن انداز یا روایتی چھڑی کا استعمال بالکل نہیں، چہرے اور لہجے کی سختی ہی طلبہ کو شرارتوں سے باز رکھنے کے لیے کافی۔ اگر کبھی زجر و توبیخ کے لیے مارنے کی ضرورت پڑی تو بائیں ہاتھ کا طمانچہ دن میں تارے دکھلانے والا۔

ایک دفعہ مجھے بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ دیکھنے کو ملا ہے جواب تک ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہے۔ مدرسہ کے احاطے میں ایک پھل دار درخت تھا، اس پر چڑھنے کی غلطی ہوگئی، شومیٔ قسمت قاری صاحب نے دیکھ لیا، پھر بائیں ہاتھ سے ایک زوردار تھپڑ، دس بارہ سال کے بچے کو واقعی تارے نظر آگئے، اور اس کا درد آج تک ذہن میں موجود، یہی وہ کسک ہے جو ان کی دعاؤں کے ساتھ اس طرح ملی کہ میں اسے اپنے لیے زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں، کاش کہ ایک اور طمانچہ!! دراصل قاری صاحب کے بائیں ہاتھ میں چوٹ کی وجہ سے کچھ کمی آگئی تھی اور ہاتھ پورے طور پر سیدھا نہیں ہو پاتا تھا، پتہ نہیں اس زاویہ قائمہ کے حساب سے کیا شکل بنتی تھی کہ اسی ہاتھ سے چوٹ زیادہ لگتی تھی۔

شہر گریڈیہہ کے مختلف اجتماعات میں ان کے خطابات بھی ہوتے تھے، ابھی ہم طلبہ میں اس کی پہچان ہی نہیں تھی کہ وہ اچھے مقرر ہیں یا نہیں، اور جب دیو بند سے فراغت کے بعد ہم نے ان کی تقریریں سنیں تو معلوم ہوا کہ وہ اچھے خطیب و واعظ بھی ہیں۔ ورنہ عام طور پر دیو بند کے طلبہ کا یہ خیال ہوا کرتا تھا کہ مظاہر علوم سہارن پور کے طلبہ و فضلاء میں خطابی صلاحیت نہیں ہوتی، الا ماشاء اللہ۔ مگر حضرت الاستاذ قاری محمد ایوب صاحب کی ایک امتیازی خوبی ان کی خطابت تھی، پر جوش اور طوفان انگیز تقریر نہیں بلکہ شیریں لہجہ، پر تاثیر انداز بیان اور خالص اصلاحی موضوعات، بلاشبہ جھارکھنڈ کے چند اضلاع میں اصلاح معاشرہ کے لیے انھوں نے

جو مواعظ بیان کئے ہیں، کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں ہوسکتا، اور نہ کسی کی تقریر اتنی مؤثر اور دیرپا ثابت ہوسکی ہے۔

ایک خاص وصف جو قاری صاحب کا امتیاز ہے، وہ ان کا باوقار اور سنجیدہ لہجہ، عالم کی شان، حیثیت اور شناخت ان کے قول وعمل میں، گفتگو نہایت نپے تلے اور متین انداز میں اور رکھ رکھاؤ عالمانہ وقار کے ساتھ، مدرسہ کی مالی فراہمی کے لیے گاؤں، بازار اور پبلک مقامات پر بھی جاتے رہے ہیں مگر عوامی جگہوں پر کچھ کھانے پینے سے قطعی احتراز کرتے، گفتگو کے دوران غیر سنجیدہ موضوع پر بھی صرف مسکراہٹ، اور وہی مسکراہٹ جس میں آواز کی شیرینی، لحن وتجوید، شفقت ومحبت سب مدغم۔

اپنی ان خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے وہ علاقہ کے سب سے مقبول اور مستند عالم دین مانے جاتے رہے، اسی لیے امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے جب گریڈیہہ میں دارالقضاء قائم کیا تو ان کو ہی قاضی شریعت مقرر کیا اور تاعمر اسی حیثیت سے اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے۔

جامعہ حسینیہ گریڈیہہ کے صدر مدرّس کی حیثیت سے ۲۰۰۵ء میں وہ ریٹائر ہوگئے، مگر معتقدین ومخلصین اہل شہر نے جامع مسجد میں بحیثیت خطیب ودینی رہنما کے باصرار تاحیات باقی رکھا۔

حضرت مولانا عبدالحق اعظمیؒ

جامعہ حسینیہ میں ہمارا دوسرا سال تھا، وہاں کے ایک نہایت وجیہہ اور باصلاحیت مدرّس حضرت مولانا افتخار احمد اعظمی ہوا کرتے تھے (جو بعد میں مئو کے کسی مدرسے میں شیخ الحدیث بھی رہے) وہ مستقل طور پر مدرسے سے رخصت ہو گئے مگر اپنی جگہ پر اپنے ہی ہم وطن تجربہ کار اور باصلاحیت مدرّس مولانا عبدالحق اعظمی کو مامور کر دیا، وہ گریڈیہہ میں آئے تو ان کے ساتھ ان کے دو شاگرد حبیب الرحمٰن جگدیش پوری اور نصیر احمد سیوانی بھی آئے، دونوں جلالین و مشکوٰۃ کی جماعت کے طالب علم تھے، اس لیے مشکوٰۃ کی جماعت بھی بن گئی، ورنہ جامعہ میں عام طور پر شرح جامی تک کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ حبیب الرحمٰن جگدیش پوری اب ماشاء اللہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی استاذ درجۂ علیا دارالعلوم دیوبند ہیں۔

حضرت مولانا سے متعلق ہماری کتاب "علم الصیغہ" تھی، نہایت کامیاب مدرّس اور بے انتہا سخت مزاج، وہ درس و تدریس کے ساتھ طلبہ کی نگرانی بھی کرتے، حضرت مولانا ایک سال کے بعد ہی واپس وطن تشریف لے گئے، لیکن اس دوران علاقے کے پسماندہ اور ان پڑھ لوگوں میں جا کر خطاب کرنا، دینی اجلاس میں شرکت، مدرسہ کی مالی فراہمی کے لیے دور دراز کے گاؤں تک جانا ان کی مشغولیات کا ایسا حصہ رہا کہ وہاں کے لوگ آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔

حضرت مولانا مئو اور بنارس کے کئی مدرسوں میں اعلیٰ درجات کی تدریس کے

فرائض انجام دیتے رہے اور اپنی سادہ مزاجی، تدریس میں لگن اور خداداد صلاحیت کی بنیاد پر ۱۹۸۲ء میں انتظامی انقلاب کے بعد دارالعلوم دیوبند میں استاذ حدیث کے بطور طلب کئے گئے اور بخاری شریف جلد ثانی کی تدریس بھی ان کے سپرد ہوئی اور تاحیات بڑی کامیابی کے ساتھ بطور نائب شیخ الحدیث درس وتدریس سے وابستہ رہے اور طلبہ میں مقبول بھی۔ اپنی سادگی اور یکسوئی کی وجہ سے طلبہ واساتذہ میں ان کا ادب واحترام رہا۔

حضرت الاستاذ اخیر عمر میں بہت ضعیف ہو چکے، مگر یادداشت اسی طرح محفوظ، ۴۵ رسال قبل گریڈیہہ کے واقعات یاد اور ملاقات ہونے پر دریافت بھی فرماتے، اللہ کا شکر ہے کہ حضرت شیخ اپنی دعاؤں اور شفقتوں سے نوازتے رہے ہیں، جو میرے لیے بڑی سعادت ہے۔

حضرت مفتی بلال احمد بھاگلپوریؒ

دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فیض یافتہ، نہایت حسین وجمیل اور بیدار مغز و باصلاحیت شخصیت، ضلع بھاگلپور کے قصبہ ناتھ نگر کے رہنے والے، جامعہ حسینیہ گریڈیہہ میں قدیم مدرس تھے اور ہماری ابتدائی عربی کی کتابیں ان سے متعلق، ہمارا بچپن ان کی عظمت وصلاحیت سے نا آشنا، اتنا یاد ہے کہ سبق اس طرح پڑھاتے کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتا۔ نہایت شفیق اور مہربان، ان کے ایک صاحبزادے مولانا ضیاء الرحمن ضیاؔء اس وقت جامعہ حسینیہ میں زیر تعلیم تھے، وہ بھی نہایت ذہین وفطین، حافظہ بے انتہا مضبوط، ادبی ذوق، شعروشاعری کا شوق، کتابیں بھی ازبر، اور یہ سب موروثی طور پر اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ میری طالب علمی کے زمانے ہی میں وہ گریڈیہہ چھوڑ کر وطن واپس جاچکے تھے مگر دینی مدرسے سے وابستگی برقرار تھی۔

حضرت مفتی صاحب کی شخصیت اور اجاگر ہوتی جو وہ کسی بڑے ادارے سے وابستہ رہتے مگر صرف بھاگلپور ہی کے ہوکر رہ گئے۔ البتہ مولانا ضیاء الرحمٰن ان کا نام روشن رکھنے کو بہت ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی زندگی میں ضیاؔء بھاگلپوری کے نام سے پہچانے جاتے تھے، وہ یہاں کی زندگی میں میرے مشیر ورہنما ومربی بھی رہے۔

حضرت مفتی بلال احمد صاحب کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں، مگر ان کے انتقال کے بعد اخبار ''دیش بدیش'' میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جن میں ان کے علمی سفر کا حال اور کچھ خدمات کا تذکرہ تھا وہی حاصل ہوسکا۔

مفتی صاحب ابتدائی جماعت کی تعلیم کے لیے بھی دیو بند پہنچ گئے، اور فارسی کی کتابیں امام فارسی حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دیو بندی (والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ) سے پڑھیں، دیگر اساتذہ میں حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب، امام المنطق مولانا غلام رسول ہزاروی، علامہ ابراہیم بلیاوی اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ ہیں، خاص طور پر علامہ ابراہیم بلیاوی کی خدمت میں ابتدا ہی سے رہے، انھیں کی نگرانی اور تربیت میں دارالعلوم دیو بند میں کئی سال گذارے، ارشاد و بیعت کا تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے قائم کیا، جن سے انھیں والہانہ عقیدت بھی تھی۔

دیو بند سے فراغت کے بعد ایک سال دہلی میں تعلیم حکمت کے لیے مقیم رہے، پھر جب وطن لوٹے تو محلہ ناتھ نگر، بھاگلپور میں ایک دینی مدرسے ''احیاء العلوم'' کی بنیاد ڈالی، اور اپنی ساری علمی صلاحیت اور توانائی اسی کے لیے وقف کر دی، چند سال کے لیے جامعہ حسینیہ گریڈیہہ میں استاذ رہے، جہاں راقم الحروف کو ان سے پڑھنے کا موقع ملا۔

۱۹۹۷ء میں وفات پائی، بھاگلپور اور اطراف میں ان کی بزرگی و تقویٰ اور علم و عمل کا جو شہرہ تھا وہ روزنامہ ''دیش بدیش'' کی اس شہ سرخی سے لگائی جا سکتی ہے جو ان کے انتقال پر لگی تھی، اخبار کا پہلا صفحہ اور پہلی چھ کالمی خبر و سرخی، کچھ اس طرح:

''نمونۂ اسلاف استاذ العلماء حضرت مفتی بلال احمد صاحب کا انتقال پر ملال''

''کاروبار زندگی معطل، کارخانے بند، ہزاروں عقیدت مندوں نے اشکبار آنکھوں سے تجہیز و تکفین میں حصہ لیا۔''

قاری محمد ابراہیم مفتاحیؒ

غالباً جامعہ حسینیہ گریڈیہہ میں ہمارا تیسرا سال تھا، جماعت تھی ہدایۃ النحو اورنورالایضاح کی، نئے مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا، جھارکھنڈ کے قصبہ جامتاڑا (جواب ضلع بن چکا ہے) کے رہنے والے، مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ سے فارغ التحصیل، ان سے متعلق ہماری کتاب ہدایۃ النحو تھی، ان کی مادری زبان غالباً بنگلہ تھی، مگر نہایت نفیس اردو بولتے تھے، سبق اس طرح پڑھاتے تھے کہ ہدایۃ النحو کی اردو شرح ان کے سامنے ہوتی اور ہمیں کتاب کا درس دیتے، عجیب لگتا تھا کہ استاذ اردو شرح کو سامنے رکھ کر پڑھائیں، ہم مبتدی اور کم عمر بچوں کو بھی اُن کی اس کمزوری کا احساس تھا، ایک بار صدر مدرّس حضرت قاری محمد ایوب سے اس کی شکایت کی تو انھوں نے مسکرا کر ہمیں سبق جاری رکھنے کی تاکید کی۔ پھر بتایا کہ قاری ابراہیم صاحب فراغت کے بعد دماغی خلل کے شکار ہوگئے تھے اور اب نارمل ہیں، مگر ابھی ان کا حافظہ کمزور ہے اس لیے اردو شرح کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے بڑی دلجمعی کے ساتھ ان سے ہی پوری کتاب پڑھی، کتنا سمجھ پائے اور کتنا یاد رہا اس سے قطع نظر اس دن سے ہمارے دلوں میں حضرت قاری صاحب کی عقیدت زیادہ ہوگئی۔

سال دو سال کے بعد قاری صاحب نے تدریس چھوڑ دی اور جامتاڑا میں ایک دکان کرلی، مگر علم اور علماء سے برابر تعلق رکھا، علمی اور دینی مسائل پر اہل علم سے گفتگو اور مباحثے جاری رہتے، بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم اعزازی طور پر دیتے

رہے، مسلمانوں کے معاملات ان کے مسائل اور دشواریوں پر ہمیشہ نظر رکھی اور اس کے لیے جدوجہد بھی کرتے رہے، جامتاڑا ٹاؤن میں مسلمانوں کی آبادی بہت ہی کم ہے مگر اطراف کے گاؤں میں بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، ان کے دینی مرجع اور رہنما آپ ہی رہے اور ہیں۔

عرصۂ دراز کے بعد ان کے یہاں حاضری ہوئی تو بے انتہا مسرت کا اظہار فرمایا، دارالعلوم دیوبند اور وقف دارالعلوم سے وابستگی کا انھیں علم تھا اس لیے علمی ترقی کی دعائیں دیتے رہے، اب حال یہ ہے کہ وہ مجھے ملاقات اور حاضری پر اصرار بھی کرتے ہیں اور جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ علاقے میں کہیں کسی دینی اجتماع میں میری تقریر ہے تو بحیثیت سامع تشریف لاتے ہیں اور بیحد حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، مجھ کم علم اور بے مایہ کی اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی ہے؟

خدا ان کی عمر دراز فرمائے اور ان کی خدمات کا اجر جزیل عطا کرے، مجھے اُن جیسے مخلص و مہربان استاذ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔(۱)

(۱) ۲۰۱۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔
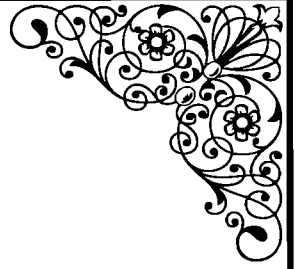
اشرف المدارس کلٹی
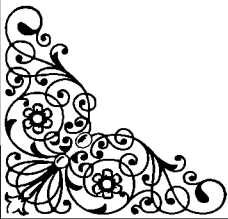
ضلع بردوان (بنگال)

مدرسہ اشرف المدارس کُلٹی

ضلع بردوان (بنگال)

مغربی بنگال کا ایک معروف ضلع بردوان ہے، اسی کا ایک قصبہ کُلٹی ہے، جس کی آبادی بہت زیادہ نہیں اور نہ اس کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت ہے، مگر ایک عجیب بات یہ تھی کہ بنگال کا یہ قصبہ تھا اور یہاں کسی جگہ بنگال کی تہذیب وثقافت کا کوئی اثر نہیں، اس زمانے میں بھی بنگلہ زبان بولنے والے کہیں دکھائی نہیں دیئے، دراصل یہاں اسٹیل کا ایک کارخانہ قائم ہوا، اور اس سے ملازمت کی راہ سے یا تجارت کے عنوان سے جو آبادی ہوئی وہ بہار کے بھوجپوری خطے کے افراد پر مشتمل تھی، مرکزی محلوں میں ضلع آرہ اور بھوجپور کے لوگ آباد تھے جو اِس اسٹیل فیکٹری سے جڑے ہوئے تھے اس لیے لامحالہ طور پر یہاں بولی جانے والی زبان بھوجپوری تھی، محلوں میں، دکانوں میں اور مارکیٹ میں جہاں بھی جاتے محسوس ہوتا کہ آرہ اور چھپرہ کے کسی علاقے میں ہیں، اردو زبان کا استعمال کم اور بھوجپوری زیادہ، میرا قیام یہاں ایک سال بھی نہیں رہا مگر مدرسہ اور محلوں میں رہنے والے لوگوں کی وجہ سے خود بھی بھوجپوری زبان پر اس طرح قدرت ہوگئی کہ عرصۂ دراز تک دارالعلوم دیوبند میں بھی اپنے چمپارنی احباب کے ساتھ انھیں کی زبان میں گفتگو ہوتی اور اب جب کہ چالیس سال سے زائد کا عرصہ ہوگیا ہے بھوجپوری زبان میرے لیے دوسری مادری زبان کی طرح ہے۔

جامعہ حسینیہ گریڈیہہ میں چار سال گزارنے کے بعد مدرسہ اشرف المدارس کلٹی میں داخل ہوا، دراصل ایک ادارے میں طویل مدت گزارنے کے بعد داعیہ

پیدا ہوا کہ کسی دوسرے مدرسے سے استفادہ کرنا چاہئے، چند ہم سبق ساتھی وہاں سے نکلے اور ہم نے بیگوسرائے ضلع کے مدرسہ حسینیہ چلمل کا رخ کیا، معلوم ہوا تھا کہ جامعہ کے ایک سب سے قابل استاذ علامہ عثمان غنی گریڈیہہ چھوڑ کر اپنے وطن کے مدرسے میں مدرّس ہیں، وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ علامہ نے یہ جگہ بھی چھوڑ دی ہے، وہاں سے فوراً ضلع بھاگلپور کے نواح میں شاہ جنگی علاقے میں ایک مدرسے تک کا سفر کیا، وہاں کی آب وہوا اور آبادی مانوس نہیں لگی تو دو دن کے بعد اسے بھی الوداع کہہ دیا، ماہ شوال ختم ہونے کو تھا اور عام طور پر مدارس میں اس وقت تک داخلے بند ہو چکے ہوتے ہیں، گریڈیہہ واپس جانے پر طبیعت قطعی آمدہ نہیں تھی، اس لیے اپنے وطن سے قریب تر علاقے کے اشرف المدارس پر توجہ ہوئی، میرے ساتھی واپس گریڈیہہ چلے گئے، اور میری سرپرست میری نانی نے ایک قریبی عزیز کے حوالے سے گلٹی میں داخل کرادیا۔

اجنبی جگہ، اجنبی ماحول اور اجنبی زبان، بادل نخواستہ وہاں داخل ہو کر پڑھنے میں مشغول ہو گیا، ایک طالب علم بچپن میں کسی ادارے یا اس کے افراد کی اہمیت کا اندازہ بھلا کیا کرسکتا ہے اللہ کی توفیق رہنمائی کرتی ہے تو بغیر تلاش کے بھی ایسی سعادتیں حاصل ہو جاتی ہیں جن کا تصور تک نہیں ہوتا۔ گلٹی میں رہتے ہوئے ایک ایسی ہی سعادت راقم الحروف کے حصے میں بھی آئی۔

دراصل اشرف المدارس کی تعمیر ایسی تھی کہ اس پر کسی دینی، عربی مدرسے کا گمان ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑا ہال اور اسی کے اندر دو چار کمرے، بالائی حصے میں مطبخ، اپنی مسجد ہی نہیں تھی، طلبہ کو نماز کے لیے محلے کی قریب کی مسجد میں جانا پڑتا تھا، اور وہ مسجد اتنی مبارک کہ اس کے ایک حجرے میں عارف باللہ ولی کامل حضرت مولانا عبدالرشید رانی ساگری رحمۃ اللہ علیہ کا قیام ہوا کرتا تھا۔ حضرت رانی ساگری بلاشبہ ریاست جھارکھنڈ میں وارد ہونے والے اور اپنے فیوض و برکات عام کرنے

والے پہلے بزرگ تھے، وہ اصلاً ضلع آرہ (بہار) کے رہنے والے تھے مگر مستقل اقامت ضلع چترا کے مدرسہ رشید العلوم میں تھی، مہینے دو مہینے کے بعد چند ہفتوں کے لیے کلٹی تشریف لاتے، یہاں ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم رہا کرتا تھا، اور حضرت ان کے تزکیہ اور روحانی تربیت کے علاوہ اپنی مجالس میں خطاب و بیان کے ذریعہ عام لوگوں کو فیض پہنچاتے۔

ہم سبھی طلبہ بعد نماز عصر ان کی مجلس میں شریک ہوتے، ان کا بیان سنتے، یاد رکھنے اور استفادہ کرنے کی عمر ہی نہیں تھی، مگر ان کا نورانی چہرہ اب بھی یاد ہے، ان کی توجہات اور دعائیں ہمارے کام آئیں۔

میرے لیے اشرف المدارس کلٹی میں نصابی کتابوں کی تکمیل کی مجبوری بھی نہیں تھی، کیوں کہ بیشتر کتابیں پہلے سے پڑھی ہوئی تھیں، مگر اساتذہ سے مزید استفادے کا موقع ملا، اور سب سے بڑی سعادت حضرت رانی ساگری رحمۃ اللہ علیہ کا قرب، ان کے نورانی فیوض، مجالس میں شرکت، اور ان کی دعاؤں کی صورت میں حاصل ہوئی۔ **فالحمد للہ علی ذلک.**

حضرت رانی ساگری کے حالات زندگی اور ان کی خدمات پر مشتمل ایک سوانح حیات حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی مفتی دارالعلوم دیو بندؒ نے تحریر فرمائی ہے اس میں تفصیلات موجود ہیں۔

مولانا محمود الحسن گیاویؒ

خوبصورت نورانی چہرہ، حسین و وجیہہ، سر پر سفید عمامہ، عمر رسیدہ بزرگ شخصیت، یہ تھے میرے استاذ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب گیاوی نور اللہ مرقدہٗ، تلمیذ امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، دار العلوم دیوبند سے نابغۂ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے باصلاحیت تلمیذ خاص جن کو عربی میں بھی کتاب اور اس کی شروحات لکھنے کی قدرت حاصل تھی، ایک دفعہ انھوں نے ایک کتاب کا مسودہ بھی دکھلایا تھا جو نہایت عمدہ عربی تحریر میں تھا۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ حضرت الاستاذ ایک ایسے دور افتادہ غیر معروف مدرسے میں تدریس پر مامور تھے، ان کی صلاحیتوں کے جلوے کسی عظیم ادارے میں نظر آتے۔

میں ۱۹۶۶ء میں اشرف المدارس میں داخل ہوا اور مقررہ نصابی کتابوں میں شرح جامی بحث فعل اور قدوری تھی، میرے ہم درس مولوی راشد حسن گیاوی تھے جو حضرت مولانا کے فرزند تھے، ہم دو افراد پر مشتمل یہ جماعت تھی اور قدوری کے علاوہ جملہ کتابوں کی تدریس حضرت سے ہی متعلق تھی، حضرت کے لیے ایک حجرہ مخصوص تھا، وہی قیام گاہ اور وہی ان کی درسگاہ، اس لیے ہمیں اوقات درس میں ہمہ وقت اسی میں بیٹھنے اور پڑھنے کا موقع ملتا، مذاکرہ اور تکرار بھی وہیں، حضرت کا اونچا مقام،

عظیم علمی شخصیت اور ولی صفت بزرگ اور ہم کمسن دولڑکے، کتابیں یاد کرنے اور بار بار استفسار کرنے کی پوری چھوٹ تھی۔ حضرت کچھ لکھنے یا مطالعہ کرنے میں مشغول رہتے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے غالباً تین صاحبزادے تھے، حامد حسن، خالد حسن، راشد حسن، مؤخر الذکر میرے رفیق درس کلٹی میں بھی تھےاور دارالعلوم دیوبند میں بھی، تکمیل ادب عربی بھی ساتھ ہی کی تھی، حامد حسن بڑے صاحبزادے تھے جو ادیب اور شاعر تھے، دوسرے صاحبزادے ہم سے نیچی جماعت میں پڑھتے تھے اور نہایت ذہین، بہترین منتظم اور ہمارے رہنما۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی ان کو سجاد لائبریری کے ناظم کے بطور بہت مستعد دیکھا، ان کے لڑکے شاہد حسن گیاوی (جہان آبادی) بھی دارالعلوم دیوبند کے باصلاحیت فاضل ہیں، اس طرح حضرت الاستاذ کے نسبی وارثوں نے بھی علمی اور دینی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ اب غالباً دونوں بھائی، خالد حسن اور راشد حسن کسی اسکول میں ٹیچر ہیں۔

حافظ انوار الحق ندویؒ

میری جماعت کی صرف ایک کتاب ''قدوری'' کے استاذ حافظ انوار الحق ندوی صاحب تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل عالم تھے مگر صرف حافظ صاحب کے نام سے مشہور تھے، لمبا قد، خوبصورت، سلیقہ مند، رہن سہن میں بیحد نفاست پسند، سر پر دوپلّی ٹوپی ایسی کہ وہ کوئی نواب یا زمیندار لگتے تھے، قاسمی اور ندوی کا ہمیں فرق ہی نہیں معلوم تھا، البتہ طالب علمانہ ذہن یہ ضرور کرید کرتا تھا کہ حافظ صاحب عربی کی نصابی کتابیں کیسے پڑھاتے ہیں جب کہ وہ صرف حافظ قرآن ہیں، جب حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مدرسہ سے رخصت ہوئے تو مدرسہ کی نظامت حافظ صاحب سے ہی متعلق رہی، مگر معلوم ہوا کہ ان کے دور میں مدرسہ نے ترقی نہیں کی، اور اب تو وہ ابتدائی دینیات اور حفظ و ناظرہ کا مکتب ہو کے رہ گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، کلٹی ایک صنعتی قصبہ تھا اس لیے رونق بھی تھی، فیکٹری میں ملازم افراد کے بچے دینی تعلیم حاصل کرنے اسی مدرسہ میں داخل ہوا کرتے تھے، مگر گذشتہ چند سالوں سے فیکٹری بند ہوگئی ہیں، بے روزگاری بھی ہوئی، اور کثیر مسلم آبادی والا یہ قصبہ بھی حالات کا شکار ہے، غالباً یہ بھی ایک خاص وجہ ہے کہ مدرسہ کے معاونین بہت کم ہو گئے اور عام طور پر اس مدرسہ کے اخراجات کی کفالت خود یہیں کی آبادی سے ہو جایا کرتی تھی۔ اب وہ وسائل بھی کم ہو گئے،

افراد بھی ہجرت کرنے لگے اس لیے مدرسہ بھی تنزلی کا شکار ہو گیا۔

حافظ انوار الحق صاحب کے غالباً ہم وطن حافظ واعظ الحق چمپارنی بھی یہاں درجۂ حفظ کے استاذ تھے اور بہت سخت مشہور تھے، مگر اس دور میں حفظ قرآن کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ادارہ اطراف کے چند اضلاع میں بھی نہیں تھا، حافظ واعظ الحق کے دولڑکے نور الحق اور ضیاء الحق درجۂ حفظ میں اپنے والد کی سختی اور پٹائی کے سب سے زیادہ شکار تھے، مگر یہ دونوں بھائی جب دارالعلوم دیوبند میں تکمیل درجات عربی کے لیے آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ قرآن پاک ان کو ازبر یاد ہے، ان دونوں بھائیوں سے میرا برادرانہ تعلق آج بھی دل میں موجزن ہے جب کہ عرصہ ہوا ملاقات بھی نہیں۔
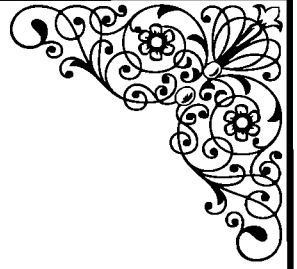
جامعہ مظاہر علوم

سہارن پور (یوپی)
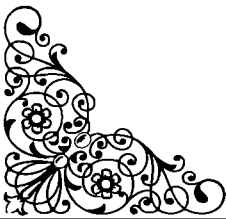
سہارن پور، دہلی سے جانب شمال مغرب تقریباً دوسو کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک معروف شہر اور ضلع ہے، جو صوبہ اتر پردیش کا آخری مغربی ضلع ہے، اور یہ اتر اکھنڈ کے ضلع دہرہ دون اور ہریدوار سے متصل ہے، اس کے مغرب میں صوبہ ہریانہ کے مشہور شہر جمنا نگر، جگادھری، اور انبالہ ہیں، اس کے مشرق میں ضلع مظفر نگر واقع ہے۔ اس ضلع کی شہرت آموں کے باغات، گنے کی کھیتی، لکڑی کی صنعت اور علمائے دین کی کثرت کے ساتھ قصبہ دیوبند کے مرکزی مقام کی وجہ سے پوری دنیا میں ہے اور شہر سہارن پور کو ہندوستان کے دیگر شہروں سے امتیاز لکڑی کی صنعت سے حاصل ہے۔ اس ضلع کے چند قصبے پوری دنیا میں اپنی خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے مشہور ہیں، خاص طور پر ۱- دیوبند ۲- گنگوہ ۳- نانوتہ ۴- روڑکی (جو اَب ہریدوار ضلع کا حصہ بن چکا ہے۔)

ہندوستان کی پہلی تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں نمایاں جدوجہد اور قربانیوں کے لیے جن اضلاع کی خدمات سرفہرست ہیں ان میں میرٹھ، مظفر نگر، اور سہارن پور ہیں، یہاں کے مسلمانوں اور خاص طور پر علمائے دین نے انگریزوں کے خلاف اس بغاوت میں نمایاں کردار ادا کیا اور انگریزوں کی انتقامی کارروائی کے سب سے زیادہ شکار یہیں کے لوگ ہوئے، علمائے دین کو قتل کیا گیا، پھانسی دی گئی یا جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔

پھر چند انفاس قدسیہ اور علمائے دین نے پر آشوب اور بیحد مایوس کن حالات میں دین اور دینی علوم کی اشاعت وحفاظت، اسلامی تہذیب وعقائد کے تحفظ کے لیے اسی ضلع کے ایک مقام ''دیوبند'' میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد ۱۸۶۶ء میں رکھی تو اہل شہر نے بھی چند ماہ کے بعد باضابطہ طور پر ایک عربی مدرسہ قائم کیا جو سو سال سے زائد کے عرصے میں ایک عظیم اسلامی درسگاہ کی حیثیت سے معروف ومعترف ہے، یہ درسگاہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور ہے، دارالعلوم دیوبند ہی کے طرز پر اور انھیں حالات میں اور ان ہی اغراض ومقاصد کے لیے اس ادارے کا قیام بڑی کسمپرسی اور ابتدائی درجے سے ہوا، اس کے بانی، مہتمم اور مدرّس اوّل حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارن پوری تھے، جو پہلے پہل روایت کے مطابق اپنے گھر میں ہی طلبہ کو دینی تعلیم دیتے تھے، ضرورت اور حالات نے ایک مستقل درسگاہ (مدرسہ) کی بنیاد ڈالنے کی راہ بنائی تو حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا سخاوت علی انبیہٹوی کی تدریس کے ساتھ مدرسہ کی ابتدا کر دی، جو کرائے کے مکان میں ہوئی۔

دس سال کے بعد یہ مدرسہ اپنی عمارت میں پہنچا تو اس کا نام مظہر علوم تجویز ہوا اور تکمیل کے لحاظ سے تاریخی نام ''مظاہر علوم'' رکھا گیا اور اسی نام سے آج تک یہ ادارہ معروف ہے، اس نام میں مدرسہ کے روح رواں اور مدرسہ کے مربی حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے، یہ مدرسہ مظاہر علوم درس وتدریس اور دین کی خدمت میں ترقی کرتا رہا، عربی درجات دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی رہی جو اب تک جاری ہے۔ سو سال سے زائد عرصے سے دین کا یہ قلعہ ترقی پذیر رہا، نامی گرامی اساتذۂ وقت اور ماہرین علوم دینیہ اس میں درس دیتے رہے، اور اکابر وقت اس کی سرپرستی ونگرانی فرماتے رہے۔

ابتدائی دور کے مدرسین میں مایۂ ناز محدث حضرت مولانا احمد علی سہارن پوری، محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد (صاحب بذل المجہود)، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی (صاحب اعلاء السنن)، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ، پھر حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی (بانیٔ جماعت تبلیغ) مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب جیسے حضرات مظاہر علوم کے درجۂ علیا کے اساتذہ رہے اور آخری دور میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ حضرت مفتی مظفر حسین صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد یحییٰ، حضرت مولانا محمد عاقل سہارن پوری، حضرت مولانا محمد یونس (شیخ الحدیث) وغیرہ حدیث اور اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا درس دے رہے ہیں۔

مدرسہ کی سرپرستی اس عہد کی نادر روزگار شخصیتوں کے ذریعہ ہوتی رہی، قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہم اللہ جیسے اکابر کے نام سرپرستوں میں شامل رہے ہیں، اکابر دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حافظ محمد احمد صاحب وغیرہم مستقل طور پر مظاہر علوم میں قدم رنجہ فرماتے رہے ہیں، طلبہ کے امتحانات کیلئے اور اجلاس میں شرکت بھی کی ہے، اور علمی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

سہارن پور کا یہ عربی مدرسہ، مظاہر علوم میں تبدیل ہوا، پھر جامعہ کی شکل اختیار کر گیا، اور سو سال پورے ہوئے تو اس کی تعلیم اور تعمیر میں بیحد ترقی ہو چکی تھی، یہاں سے فراغت حاصل کرنے والوں کی تعداد ہزاروں ہو چکی تھی اور مظاہر علوم کی دار قدیم، کتب خانہ، دفاتر، شاخ مدرسہ خلیلیہ کے علاوہ دار جدید کی عظیم الشان

عمارت اور مسجد کی تکمیل ہوچکی تھی، طلبہ کی تعداد بڑھتی رہی، اور فضلائے مظاہر علوم ملک و بیرون ملک دین اور دینی علوم کی خدمت میں مسلمانوں کی تاریخ میں اہم حصہ بن چکے تھے۔

●●●

ٹھیک سو سال پورے ہونے کے بعد ۱۹۶۷ء میں راقم الحروف نے مظاہر علوم سہارن پور میں شرح جامی کی جماعت میں داخلہ لیا، کتابوں کے حصول کے لیے حضرت مولانا عبدالمجید صاحب ناظم تعلیمات کی خدمت میں پہنچا تو میری کم عمری اور شرح جامی کی جماعت میں داخلے پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا تھا: اپنی جماعت کی کتابیں بھی اٹھا لوگے؟ پھر دعائیں بھی دی تھیں۔ داخلے کی کارروائی پوری ہوئی، امداد طعام کے اجراء کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ قرآن شریف کا ایک پارہ حفظ کر کے سنانا شرط ہے، عم کا پارہ تقریباً پورا یاد کیا اور امتحان دیا پھر مطبخ سے امداد جاری ہوئی۔

اس سال اساتذۂ مظاہر علوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہٗ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ (ناظم مظاہر علوم)، حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ، حضرت مولانا محمد یونس جونپوری، حضرت مفتی یحییٰ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا وقار علی صاحب جیسے حضرات موجود تھے۔ مگر ان حضرات سے متعلق اپنی کوئی کتاب نہیں تھی، یہ سب علیا درجہ کے اساتذہ تھے اور ہماری جماعت متوسطات کی تھی، شرح جامی کی جماعت کے اساتذہ تھے امام النحو علامہ صدیق کشمیری، حضرت مولانا محمد ظریف سہارنپوری، حضرت مفتی عبدالقیوم رائے پوری اور حضرت مولانا محمد اللہ صاحب۔

یاد رہے کہ اس سال دو فضلائے مظاہر ''فنون'' کے درجے میں زیر تعلیم تھے، طلبہ میں مشہور تھا کہ دونوں سال گذشتہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے ہیں اور نہایت

ذہین ومحنتی ہیں، مولوی محمد یعقوب سہارن پوری اور مولوی محمد سلمان سہارن پوری، پھر دونوں حضرات مظاہر علوم میں تدریس کے لیے متعین ہوگئے، اور اب بحمداللہ دونوں نامور اساتذہ میں شمار ہیں۔اسی طرح یہ بھی یاد رہے کہ ہماری جماعت سے ایک درجہ آگے یعنی مختصر المعانی، شرح وقایہ وغیرہ کی جماعت میں مولانا زبیر احمدؒ (سابق امیر جماعت تبلیغ دہلی) مولانا محمد شاہد سہارنپوری (نواسۂ حضرت شیخ الحدیث) اور مولانا وسیم احمد سہارنپوری (شیخ الحدیث جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ) زیر تعلیم تھے۔

اس وقت تمام عربی درجات کی تعلیم قدیم عمارت میں ہوتی تھی، جہاں دارالاقامہ بھی تھا اور درسگاہیں بھی، دار جدید صرف رہائشی عمارت تھی جس میں نگرانی حضرت مفتی عبدالعزیز رائے پوری علیہ الرحمہ کی تھی۔

رہائش کے لیے مجھے دار جدید کے کمرہ نمبر ۷ میں جگہ ملی، جہاں طلبۂ ضلع دمکا، ہزاری باغ اور دھنباد رہتے تھے، کمرہ نمبر ۹ میں حضرت مفتی عبدالقیوم رائے پوریؒ کی رہائش تھی، اس لیے وقتاً فوقتاً حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کی سعادت ہوجایا کرتی تھی، حضرت مفتی صاحب اکابر دیوبند وسہارن پور کے واقعات وحالات سنایا کرتے تھے۔

مظاہر علوم میں ایک سال کی تعلیم مکمل کی اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ حاصل کرلیا۔

●●●

۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند دو حصوں میں منقسم ہوا، دارالعلوم دیوبند (رجسٹرڈ) اور دارالعلوم دیوبند وقف، اس کے چند سال بعد ہی یہ حادثہ مظاہر علوم سہارن پور کو بھی پیش آیا، مظاہر علوم وقف (قدیم) اور مظاہر علوم رجسٹرڈ (جدید)۔اب سہارن پور میں دو مظاہر علوم ہیں، دونوں کی تاریخ، اغراض ومقاصد اور تعلیمی سرگرمیاں

یکساں، اساتذہ وعمارات دوحصوں میں بٹ گئے، مظاہر علوم وقف دارقدیم میں، مظاہر علوم رجسٹرڈ دارجدید میں، خیر کا پہلو یہ ہے کہ اب تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد بڑھی اور دونوں جگہ داخل طلبہ کو استفادے کا موقع مل رہا ہے۔

مظاہر علوم جدید کے ناظم پہلے حضرت مولانا محمد اللہ صاحبؒ تھے اب مولانا محمد سلمان مظاہری ہیں، مظاہر علوم وقف کے ناظم ومتولی حضرت مفتی مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ تھے اور اب مولانا محمد سعیدی صاحب ہیں اور میرے لیے یہ فخر ومسرت کی بات ہے کہ مظاہر علوم وقف کے ناظم مولانا محمد سعیدی علم حدیث میں میرے شاگرد بھی ہیں۔ نیک، صالح، ذہین، باصلاحیت اور فعال منتظم، اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور مظاہر علوم وقف کو ان کی نظامت میں مزید ترقی ومقبولیت عطا فرمائے۔ آمین

امام النحو

حضرت علامہ صدیق احمد کشمیریؒ

کشمیر کے رہنے والے علامہ صدیق احمد ۱۳۳۹ھ سے مظاہر علوم کے مدرس تھے، ابتدائی اور متوسطات کی کتابوں کا درس ان سے متعلق رہا، مگر ان کی شہرت درسِ شرح جامی سے تھی، تقریباً پچاس سال تک یہ کتاب ان سے متعلق رہی، اور گو کہ آپ کو علم منطق اور فلسفہ میں بڑی مہارت تھی مگر نحو کے تو آپ امام تھا، اس لیے آپ کو امام النحو اور علامہ جیسے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔

مجھے بھی حضرت علامہ سے شرح جامی بحث اسم پڑھنے کا شرف حاصل ہے، ان کو شرح جامی ایک طرح سے زبانی یاد تھی، ان کو کتاب دیکھنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی، طالب علم عبارت پڑھتا اور آپ اس کا ترجمہ ومطلب اس طرح بیان کرتے کہ غبی طالب علم بھی مفہوم اچھی طرح سمجھ جائے، اور عبارت کو کئی کئی بار حل کراتے، بار بار مطلب سمجھاتے۔ اس طرح ذہین طلبہ کو سبق یاد ہوجاتا اور تکرار کی ضرورت ہی نہ پڑتی، عام طور پر طلبہ ان کے درسی افادات کو قلمبند بھی کرتے تھے، یاد ہے کہ میں نے بھی ان کے افادات کو مکمل تحریر کرکے محفوظ کرلیا تھا، اور احقر کو شرح جامی اتنی ازبر تھی کہ سالہا سال تک اسی طرح یاد رہی ہے، عرصۂ دراز کے بعد جب تدریس کا موقع ملا تو حضرت الاستاذ کی بتائی ہوئی باتیں یاد آتی گئیں۔

ان کے ایک مایۂ ناز شاگرد مولانا محمد یامین صاحبؒ تھے جو اس زمانے میں شاخ مظاہر علوم میں انھیں کے طرز پر کافیہ پڑھایا کرتے تھے، حضرت علامہ کے انتقال کے بعد شرح جامی کا درس ان سے ہی متعلق رہا۔

امام النحو حضرت کشمیری ۱۹۶۷ء مطابق ۱۳۸۷ھ میں کافی ضعیف ہو چکے تھے، مگر حافظے میں خاص طور علم نحو سے متعلق کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، درس میں بھی اور درس کے بعد بھی طلبہ سے مذاق کرنا ان کی عادت تھی، ظریف الطبع تھے، بلکہ مجذوب کی طرح متواضع، سادہ مزاج اور خوش خلق تھے، عصر کے بعد عام طور پر مظاہر علوم سے قریب مسجد ''بہادران'' میں بیٹھتے اور طلبہ ان کے گرد جمع رہتے تھے۔

۱۸ر شوال ۱۳۸۹ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، شاگردوں کی ایک بڑی تعداد دیوبند میں زیر تعلیم تھی، ان کے ساتھ ہی ان کی تدفین میں شرکت کا موقع راقم الحروف کو بھی ملا تھا۔

حضرت مفتی عبدالقیوم مظاہریؒ

اسی جماعت کی دوسری بڑی کتاب ''کنزالدقائق'' تھی جو حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب سے متعلق تھی، مفتی صاحب جوان العمر، دبلے پتلے، معصوم صورت، پاکیزہ سیرت اور بہترین مدرس تھے، انداز تدریس بہت عمدہ، تفہیم میں مہارت حاصل تھی، باوقار اور سنجیدہ، گفتگو اور درس میں ٹھہراؤ، ہر لفظ اور جملہ واضح، تواضع اور انکساری کے پیکر، محبت وشفقت کے پاسدار۔

دارجدید کے کمرہ نمبر ۹ میں ان کا مستقل قیام رہا، ہم طلبہ جب ان کے پاس بیٹھتے تو وہ ہمیشہ اکابر کی باتیں کرتے، دیوبند اور مظاہر کے بزرگوں کے واقعات سناتے، دیوبند کا نام ہم نے سنا تھا، مگر شوق ورغبت ان کی باتوں سے ہوئی، اسی لیے ہم اگلے سال ہی دیوبند کوچ کر گئے۔

حضرت مفتی صاحب حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز تھے، بزرگی، نورانیت اور اخلاص ان کے چہرے، برتاؤ اور انداز سے بھی نمایاں ہوتی تھی۔ دارجدید میں علیا کے استاذ حضرت مفتی عبدالعزیز رائے پوری کی قیام گاہ بھی تھی، طلبہ ان سے خائف رہتے۔ مگر مفتی عبدالقیوم صاحب سے مانوس، جیسے اپنے والد اور مربی ہوں۔

مظاہر علوم میں انتظامیہ میں اختلاف ہوا اور ادارہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا، بعض قدیم اساتذہ مظاہر علوم وقف میں اور بعض دارجدید میں چلے گئے، حضرت

مفتی صاحب اس حادثے سے دلبرداشتہ ہوئے تو انھوں نے سہارن پور ہی چھوڑ دیا اور اپنے شیخِ طریقت حضرت رائے پوری علیہ الرحمہ کی خانقاہ سنبھال لی، وہاں سے تاعمر بیعت وارشاد، دینی رہنمائی، سلوک واصلاح اور اپنے مواعظ کے ذریعہ عامۃ المسلمین کے ایک بڑے طبقے کو مستفید فرماتے رہے۔ بہت سے مدارس کی سرپرستی بھی فرمائی۔

عرصۂ دراز غالباً پچیس سال کے بعد حضرت کی زیارت کی غرض سے رائے پور کی خانقاہ میں حاضری ہوئی، تو انھیں پہچاننے میں لمحے کی تاخیر نہیں ہوئی، وہی صورت وہی معصوم سی مسکراہٹ، جسم نحیف، انداز تکلم بھی وہی، نورانیت سے معمور وجود، فرق صرف اتنا تھا کہ داڑھی اور بال سفید ہوگئے تھے، بڑی شفقت فرمائی اور دعائیں دیں جو آج بھی میرے ہمراہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد اللہ صاحبؒ

شیخ طریقت، ماہر علوم، ادیب وکامل، ناظم مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا اسعد اللہ نور اللہ مرقدہٗ کے خلف الرشید مولانا محمد اللہ سے متعلق ہماری جماعت کی دو کتابیں تھیں، اصول الشاشی اور ترجمۂ قرآن، تدریس واعظانہ اور تفصیلی ہوا کرتی تھی، ترجمۂ قرآن تو دلجمعی سے اور شوق سے پڑھنے کا موقع ملا، مگر جس تفصیل اور تحقیق سے وہ اصول الشاشی پڑھاتے تھے مجھ جیسے کم عمر وکم فہم کی قدرتِ فہم سے بالاتر ہوتی تھی، اب تو یاد نہیں کہ کتنا سمجھا اور کیا یاد رہا تھا، اتنا ضرور ہوا تھا کہ نفس کتاب کو تکرار ومطالعہ سے پوری طرح حل کرلیا تھا، غالباً اسی لیے سالانہ امتحان میں امتیازی نمبرات ملے تھے اور کتاب خصوصی انعام میں ملی تھی، سبق میں حاضری اور استاذ کی دعاؤں کی برکت کا ثمرہ ہی تھا۔

حضرت مولانا نے فراغت کے بعد انگریزی کی تعلیم بھی پائی تھی، اس لیے عرصۂ دراز تک ''مولویت'' سے دور رہے تھے، پھر اللہ نے توفیق دی اور حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات وہدایت سے مظاہر علوم کی تدریس سے وابستہ ہوگئے اور پھر کامیاب مدرّسوں میں ان کا شمار ہونے لگا، اس دوران ان کے خادمِ خاص مولوی حبیب اللہ چمپارنی تھے۔ (جواَب مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔)

مظاہر علوم کے اختلاف کے بعد وہ مظاہر علوم رجسٹرڈ (جدید) کے ساتھ تھے اور ان کو ہی ابتدا میں ناظم بنایا گیا تھا، جلد ہی ان کی وفات ہوگئی۔
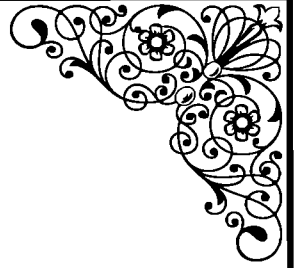
الجامعة الإسلامية

دار العلوم دیوبند
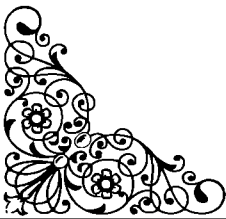
شادباش وشادزیں اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ہندوستان میں مغلیہ دورحکومت کا خاتمہ، تحریک آزادی کی پہلی کوشش ۱۸۵۷ء کی ناکامی، حاکم انگریزوں کی انتقامی کارروائی، مسلمانوں خاص طور پر علماء دین کا قتل عام، دینی اداروں کی بربادی، اسلامی تہذیب و شناخت مٹانے کی سازش، افراتفری کا ماحول، بے کسی و بیچارگی کی ظلمت، مایوسی کے مہیب سائے، اور اسلامی عقائداور مسلمانوں کے تحفظ کی راہ میں گھٹاٹوپ تاریکی کے روح فرسا دور میں روشنی کی ایک کرن:

دارالعلوم دیوبند

مسلمانوں کوان کے تہذیبی ورثے سے محروم کرنے کا استعماری منصوبہ، اور اس کی مزاحمت کے لیے اولیاء کرام وانفاس قدسیہ کی ایک جماعت کی فکرمندی، دینی علوم کی حفاظت اورقرآن وسنت کی اشاعت کے لیے پورے ہندوستان میں مدارس کا جال پھیلانے کا عزم،مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیےاور

انھیں مایوسیوں سے نکالنے کی تحریک کا نام:

دَارُالعُلُوم دِیوبَند

مسلمانوں میں روحِ ایمانی بیدار کرنے، ان کی قوتوں کو یکجا کرنے، ملک کو آزاد کرانے اور اس راہ میں قربانیاں پیش کرنے والی جماعت تیار کرنے، غیر ملکی طاقتوں کو ملک سے نکالنے کی تدابیر اختیار کرنے، اور باشندگانِ وطن کو اپنے آزاد ملک کی تعمیر نو کے خواب پورا کرنے میں بھرپور حصہ لینے کی جدوجہد کا عنوان:

دَارُالعُلُوم دِیوبَند

آزادی کے حصول کے بعد فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے، مسلمانوں کے اعمال وعقائد کی اصلاح، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا جذبہ بیدار کرنے، بدعات وگمرہی دور کرنے اور تعلیم وتہذیب سے آراستہ کر کے اچھے شہری بنانے میں اہم کردار ادا کرنے کی علامت:

دَارُالعُلُوم دِیوبَند

جی ہاں! وہی دارالعلوم دیوبند جو ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نشان، علمی تحریک کا عنوان، دینی وروحانی پہچان، حق وباطل کی میزان اور اللہ کی جانب سے امت مسلمہ پر ایک احسان ہے جو تاریخ بھی ہے، تاریخ ساز بھی، اور اسلامیان ہند کی اجتماعی آواز بھی، برصغیر ہند (ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش) میں اس کی علمی ضیا پاشیاں روز روشن کی طرح اس کا ثبوت، پھر تمام برِّاعظموں میں اس کے فرزندوں کے علمی ودینی کارنامے اس کی بیّن دلیل ہیں۔ اس عظیم الشان علمی تحریک اور اس کے افراد کی خدمت کا اعتراف انفرادی طور پر بھی ہے اور اجتماعی طریقے پر بھی، عالم اسلام نے اس کی تاریخی عظمت کو تسلیم کیا تو غیر مسلم اہل

علم کے حلقوں نے بھی اس کی اہمیت، افادیت اور عالمگیریت کا اقرار کیا۔

ازہر الہند دار العلوم دیوبند کی تاسیس کن حالات میں ہوئی، کن افراد نے اس تحریک میں حصہ لیا، اور پھر یہ علمی پودا کس طرح ایک تناور درخت کی شکل میں پروان چڑھا، اور اس کے اثرات وثمرات پوری دنیا میں کس طرح پھیلے، اور اللہ نے اس ادارے کو کیا عزت وشہرت اور مقبولیت عطا کی، ایک طویل تاریخ ہے، مختصر طور پر چند باتیں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس کے لیے سب سے پہلے تمہید کے طور پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند کی تحریر کا اقتباس پیش خدمت ہے:

''تیرہویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا، دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، صرف ڈھول کی منادی میں ''ملک بادشاہ کا'' رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ دینی شعور رخصت ہو رہا تھا اور جہل وضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کے بجائے جاہلانہ رسوم ورواج، شرک وبدعت اور ہوا پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے۔ مشرقی روشنی ڈھلتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، جس سے دہریت کا الحاد، فطرت پرستی اور بے قیدئ نفس، آزادئ فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہو چکی تھیں۔ اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خدوخال کا پہچاننا بھی مشکل ہو چکا تھا۔ چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدھم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاغ وزغن کی

مکروہ آوازوں نے لے لی تھی۔ یہ اور اسی قسم کے ہزارہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں۔ جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کے لیے کمر بستہ ہو چکا ہے۔ کہ چند نفوس قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارے میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا، جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درسگاہ قائم کی جائے ،جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں ڈھانچوں میں ڈھالی جائے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی رہنمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت، نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایماندارانہ سیاسی شعور بھی بیدار رہو۔ ان مقاصد کے لیے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے رہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیائے وقت تھے اور ان کی یہ باہمی گفت وشنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا بلکہ تبادلۂ الہامات تھا جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ مہتمم سادس دار العلوم دیوبند سے سنا کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت قیامِ مدرسہ ہے، چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ حفظ دین اور مسلمین کے لیے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے ، کسی

نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ ایک مدرسہ قائم ہو، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے، کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالم غیب کا ایک مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارے میں منجانب اللہ ان پر واقع ہوا۔

اس سے یہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردے میں ملک گیر اصلاح کی اسپرٹ چھپی ہوئی تھی۔'' (دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات)

چنانچہ ١۵؍محرم الحرام ١٢٨٣ھ مطابق ٣٠؍مئی ١٨٦٦ء کو دیوبند میں ایک عربی مدرسے کی بنیاد ڈال دی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سربراہی میں اس تحریک کی عملی شکل سامنے آئی جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے معروف ہوئی۔

قیام دارالعلوم دیوبند میں اور اس کے انتظام وانصرام میں جن اکابر نے ابتدا ہی سے اہم کردار ادا کیا وہ یہ چھ حضرات تھے:

١-حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

٢-حضرت حاجی سید عابد حسین دیوبندی

٣-حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

٤-حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی

۵-حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی

٦-حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی

●●●

دیوبند ایک قصبہ ہے جو ریاست اتر پردیش کے ضلع سہارن پور کی ایک تحصیل ہے، اور سلطنت مغلیہ کے زمانے سے اب تک اس کی یہی حیثیت برقرار رہی ہے، آبادی کے اضافے اور ضروریات زندگی کی حصولیابی کی وجہ سے اب یہ ایک شہر کی صورت اختیار کر چکا ہے، ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے بجانبِ شمال مغرب تقریباً ایک سو پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں شہنشاہ اکبر کے عہد کا ایک قلعہ بھی موجود تھا، دیوبند میں مسلمانوں کی آبادی کا پتہ ساتویں صدی ہجری سے چلتا ہے۔ یہاں پر اسلامی عہد حکومت کی تعمیر شدہ چند مسجدیں بھی اب تک موجود ہیں، مسجد قلعہ سلطان سکندر لودھی ۸۹۴ھ، مسجد خانقاہ عہد اکبری کی اور مسجد ابوالمعالی اورنگزیب علیہ الرحمہ کے عہد کی یادگار ہیں۔

اسی دیوبند کے مغربی کنارے پر ایک قدیم مسجد ''مسجد چھتہ'' کے نام سے مسلمانوں کے ابتدائی طرز تعمیر کا نمونہ بھی ہے، یہ مسجد اکثر مشائخ اور اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض و برکات رہ چکی ہے۔ اسی کے جنوب مشرق میں ایک انار کا درخت تھا، اسی مسجد میں دیوبند کے ایک بزرگ حاجی سید عابد حسین اور مولوی رفیع الدین رہا کرتے تھے جہاں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی میرٹھ سے آکر قیام پذیر ہوتے تھے۔

دیوبند کی علمی تحریک کی ابتدا اسی مسجد چھتہ سے ہوئی، جہاں انار کے درخت کے نیچے ایک استاذ اور ایک شاگرد سے تعلیمی آغاز ہوا، اور یہی تحریکِ دیوبند کی ظاہری شکل تھی جو بعد میں دنیا میں دارالعلوم دیوبند کی صورت میں سامنے آئی۔

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب میں جب دہلی اجڑی اور اس کی سیاسی بساط الٹ گئی تو دہلی کی علمی مرکزیت ختم ہوگئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادے یا تلامذہ نے جو قرآن و حدیث کی اشاعت اور تدریس کا سلسلہ دہلی میں

شروع کیا تھا جس کے اثرات پورے ملک میں پھیل گئے تھے جو ہندوستان میں اسلامی علوم کی نشأۃ ثانیہ کے علمبردار تھے اب سب اجڑ گیا، اور دوسری طرف لکھنؤ کا فرنگی محل جو فقہی خدمات کا مرکز تھا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اب نہ کوئی مرکز علوم قرآن وسنت کا باقی رہا اور نہ فقہ وافتاء کا مرجع، معقولات کا جوز ورخیر آباد میں تھا اس کے اثرات بھی مضمحل ہو چکے تھے، اس لیے ضرورت تھی ایک ایسے ادارے کی جو اِن مراکز کے علمی خدمات کی جامعیت کے ساتھ تعلیم وتدریس اور نشر واشاعت کی ذمہ داریاں پوری کر سکے، چنانچہ سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے تربیت یافتہ اور شاہ عبدالغنی مجددی وحضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگردان فیض یافتہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے دیوبند کے اس مدرسے کے ذریعہ دینی، تعلیمی تحریک کی ابتدا فرمائی۔

اور آغاز بھی توکل علی اللہ اور عوام کے تعاون کی بنیاد پر، اب نہ اسلامی حکومت تھی جو مالی سرپرستی کرتی اور نہ اوقاف کی آمدنی یا والیانِ ریاست کی فیاضی، اس لیے بانیٔ دار العلوم دیوبند نے اس مدرسے کے نظم ونسق اور اس کی بقاء کے لیے جو اصول مرتب فرمائے وہ اصول ہشت گانہ کے نام سے معروف ہیں اور اس میں بنیادی طور پر ادارے کے اخراجات کے لیے عوامی چندے پر زور دیا، حکومتِ وقت یا مستقل ذریعۂ آمدنی سے دور رکھنے کی ہدایت دی، اس طرح عامۃ المسلمین کے مالی تعاون سے مدرسہ، طلبہ اور اساتذہ وغیرہ کی ضروریات کی تکمیل ہوتی، چند سالوں کے بعد یہ مدرسہ اپنی عمارت میں منتقل ہوا اور دار العلوم دیوبند کے نام سے معروف ہوا۔

یہ علمی کارواں منزل کی طرف بڑھتا گیا، ترقی کرتا گیا اور اپنی علمی روشنی سے پوری دنیا کو منور کرتا چلا گیا، اور اب جب اس کی بنیاد کو ایک سو پچاس سال سے زائد

کا عرصہ ہو چکا ہے، یہ الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم دیوبند کی صورت میں عالم اسلام کا مشہور دینی، علمی اور روحانی مرکز ہے، برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں اسلام کی نشر و اشاعت کا یہ سب سے بڑا، قدیم ادارہ اور دینی علوم کا سرچشمہ ہے، اور پوری دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لیے ایک بے نظیر درسگاہ تسلیم کی جاتی ہے، جامعہ ازہر قاہرہ کے علاوہ اسلامی اور دینی علوم وفنون کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی قدامت، مرجعیت و مرکزیت اور تعلیمی خدمت کے لحاظ سے اتنی اہمیت رکھتا ہو، چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے، عالم اسلام سے اور دیگر براعظموں (خاص طور پر جنوبی افریقہ کے ممالک) سے طالبان علوم نبویہ کی بڑی تعداد اس ادارے کی جانب رجوع کرنے لگی، اسی دریائے علم سے سیراب ہوئی اور پھر اپنے علاقوں اور اپنے ممالک میں قرآن و حدیث کے علاوہ دیگر اسلامی علوم کی خدمت میں مشغول ہوگئی، دارالعلوم دیوبند سے ہر دور میں ایسے باکمال فضلاء تیار ہوئے جنھوں نے دینی ضرورت کے تقاضوں کے مطابق صحیح دینی عقائد اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، یہ حضرات برصغیر کے علاوہ دوسرے مختلف ممالک میں بھی علمی و دینی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں اور ہر جگہ انھیں امتیازی حیثیت سے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا مقام حاصل ہے۔

دارالعلوم کے فیضان کا سلسلہ افغانستان، سمرقند و بخارا، ملیشیا، تھائی لینڈ سے بڑھتا ہوا یورپ کے ممالک تک پھیلا ہوا ہے، جنوبی افریقہ میں اس کے فضلاء نہ صرف تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں بلکہ انھوں نے کئی اہم ''جامعات'' بھی قائم کئے جہاں فضیلت تک کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ پورے براعظم افریقہ کے طلبہ کا مرجع اور مرکز ہیں اور یہاں کے فضلاء نے امریکہ براعظم میں بھی دینی مدارس اور اسلامی سینٹر قائم کر کے اس میں دینی و تعلیمی خدمات کا یہ تسلسل جاری رکھا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام، وجود اور اس کی خدمات پر برصغیر کے مسلمانوں کو بجا طور پر فخر و مسرت حاصل ہے، کہ اس کے اکابر، فضلاء اور مستفیدین نے پوری دنیا میں اسلامی علوم کی اشاعت، مسلمانوں کی رہنمائی اور اصلاحِ عقائد و معاشرہ کی ایسی بے نظیر خدمت انجام دی ہے، کہ اسلامی حکومتوں کے خاتمے اور زوال کے وقت تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ عہد حاضر میں اقامتِ دین، اشاعتِ علوم اسلامیہ اور مسلمانوں کی جدوجہد کا روشن باب ہے، اور یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ قدیم طرز کی ایک اسلامی درسگاہ ہی نہیں بلکہ احیائے اسلام اور قیامِ ملت کی ایک عظیم الشان تحریک ہے جس نے برصغیر میں احیائے اسلام کی عظیم خدمات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں سیاسی شعور کو بھی بیدار کیا اور جدوجہد آزادی میں قائدانہ حصہ لیا۔

سو سال سے زائد کے اس عرصے میں دارالعلوم دیوبند نے علمی و دینی خدمات کے جملہ گوشوں کے لیے نمایاں رجال کار تیار کئے، تعلیم و تدریس، دعوت و تبلیغ، ادب و صحافت، فقہ و افتاء، تصنیف و تالیف، قیادت و سیادت، خطابت و امامت، اہتمام و انتظام، غرضیکہ ہر جہت میں فرزندان دارالعلوم کے کارنامے نمایاں نظر آتے ہیں، فضلائے دارالعلوم نے اپنے اپنے وقت میں اپنی صلاحیتوں اور اپنے ذوق و مزاج کے مطابق دین کے کسی نہ کسی شعبے میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے جو خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں، ان کی تعداد کا نہ شمار کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی تحدید ہوسکتی ہے۔ البتہ ان یگانۂ روزگار اور عبقری شخصیات میں سے چند نمایاں افراد کا ذکر مناسب ہوگا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے علاوہ چند وہ مشاہیر جو دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے یا پھر باہر جا کر انفرادی حیثیت سے وہ کارنامے انجام دیئے جو اجتماعی

افراد یا تنظیمیں یا اکیڈمیاں انجام دے سکتی ہیں:

مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ محمد انور شاہ کشمیری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا محمد میاں منصور غازی، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عزیر گل پشاوری، مولانا عبدالعلی لکھنوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا شمس الحق افغانی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا فخر الدین مرادآبادی، مولانا شاہ وصی اللہ، علامہ ابراہیم بلیاوی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا میرک شاہ کشمیری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد موسیٰ افریقی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا منّت اللہ رحمانی، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی، مولانا محمد منظور نعمانی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، مولانا مفتی محمود پاکستانی، مفتی محمود حسن گنگوہی اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہم اللہ اجمعین

●●●

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو ایک صدی گزرنے کے بعد اکابر دیوبند اور ارباب حل وعقد نے طے کیا کہ ایک اجلاس منعقد کیا جائے جس میں گذشتہ سوسالوں کی خدمات اور کارگذاریوں کا جائزہ ہو اور آئندہ اکیسویں صدی میں بدلتے حالات میں نئ نسل کی تعلیم وتربیت کے لیے لائحہ عمل، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی رہنمائی حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں، اور پوری دنیا میں اسلام کی دعوت وتبلیغ اور علوم

اسلام کی اشاعت کے لیے رہنما خطوط مرتب کئے جائیں۔

چنانچہ اس کے لیے ۲۱/ ۲۲/ ۲۳/ مارچ ۱۹۸۰ء کی تاریخیں متعین کی گئیں اور سرگرمی سے اس کی تیاریاں شروع ہوئیں، مختلف امور کی انجام دہی کے لیے کئی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، اجلاس کے اخراجات کے لیے فراہمی سرمایہ کی ذمہ داری اساتذۂ دارالعلوم کے سر ہوئی، نہایت اخلاص، جوش، لگن اور جدوجہد کے ساتھ فرزندان دارالعلوم بشمول اراکین مجلس شوریٰ، اساتذہ وکارکنان حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سربراہی میں مصروف ہوگئے۔ اللہ کی توفیق بھی شامل حال ہوئی اور یہ عظیم الشان اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند اپنے مقررہ تاریخوں میں اس عظمت و رفعت اور شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا جس کی کوئی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی، مسلمانانِ ہند و پاک اور عالم اسلام کا اتنا بڑا مجمع اس سے پہلے سوائے اجتماع حج کے تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پچیس لاکھ سے زائد افراد ایک قصبہ دیوبند میں بیک وقت جمع ہوگئے۔ حکومتِ وقت حیران اور پوری دنیا کے نمائندہ حضرات انگشت بدنداں، دارالعلوم دیوبند کی مقبولیت، شہرت اور مرجعیت کا یہ نظارہ چشم فلک نے اس طرح دیکھا کہ لوگوں کا اتنا ہجوم، نہ حکومت کی سرپرستی نہ تنظیموں کی چستی، سادگی پسند علمائے دین کا عام سا انتظام، مگر تائید ونصرتِ غیبی اس درجہ کہ اجلاس بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا، نہ کوئی حادثہ نہ ہنگامہ، نہ افراتفری نہ کسی طرح کی کوئی پریشانی، عقیدت مندوں، مخلصوں اور دارالعلوم کے فرزندوں کے دل کامیابی وکامرانی سے سرشار۔

دارالعلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ اس کی خدمات کا اعتراف تھا، اس کی مقبولیت کا عنوان اور اس کی شہرت کا دوامی نشان، اس ادارے کا عروج، مسلمانانِ ہند کی عظمت کا مینار اور پوری دنیا کے لیے اسلامی پیغام، اسلام مخالف قوتوں کے

دل ودماغ پر زلزلہ برپا کرنے والا، مگر اسی اجلاس کے جلو میں کچھ خفیہ ریشہ دوانیاں اور سازشوں کے تار و پود، طالع آزماؤں، جاہ ومنصب کے پجاریوں اور گندم نما جوفروشوں کی کچھ پوشیدہ سرگرمیاں، علم ودانش، فکر وتقویٰ سربہ گریباں!!

پھر شروع ہوا وہ قضیہ جو نامرضیہ کہلاتا ہے، اور ہنگاموں، مخالفتوں کا وہ سلسلہ جو ایک تلخ حقیقت ہے مگر روحانی کرب کی داستان، جو بالآخر منتج ہوا مارچ ۱۹۸۲ء کی ایک تاریک شب میں دارالعلوم کی عمارتوں پر اسی گروپ کے قبضے کی صورت میں، وہ صورت حال جو ناگفتہ بہ تھی مگر راقم الحروف ان تمام حالات وواقعات کا عینی شاہد رہا، ان حالات کا ذکر بے انتہا تلخ اور دارالعلوم کے فرزندوں کی جانب سے ہی غیر متوقع سرگرمیوں کا حامل، ان کا تذکرہ دل وجان کے لیے باعث کرب اور عقیدت واخلاص کو پاش پاش کردینے والی اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دیوبند میں رہنے والے چشم بینا سے سب دیکھ رہے تھے اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت سے وابستہ افراد اسے جھیل رہے تھے۔ منتسبین ومخلصین جو دور دراز علاقوں میں موجود تھے وہ بھی تشویش میں مبتلا، پروپیگنڈہ کے مجرّب نسخے ان پر آزمائے جارہے تھے، اس لیے اصل صورت حال سے وہ کافی حد تک لاعلم رہے۔ پھر اس غیر آئینی وغیر اخلاقی تسلط کو جواز فراہم کرنے کے لیے مقامی اور ریاستی عدالتوں میں جن کذب بیانیوں کا سہارا لیا گیا وہ الامان والحفیظ۔

خوش پوشاک اور تقویٰ صورت لیکن خود غرض ومردہ ضمیر افراد سے کیا شکوہ؟ دل کی کسک، دماغ کی اذیت اور روح کا کرب اپنے وجود میں لیے ایک سسکتی آواز صرف یہی کہہ سکتی ہے کہ تاریخ عالم نام ہے بہت سی متضاد کیفیتوں اور حالات وواقعات کا، اقوال وافعال کا، اور تاریخ اسی طرح اپنا سفر طے کرتی ہے، یہی قانونِ قدرت ہے اور یہ سفر جاری ہے!!!

●●●

دارالعلوم دیوبند کے سوسال پورے ہو چکے تھے، ہندوستان کے تمام علاقوں میں دیوبند کی شہرت وعظمت قائم ہو چکی تھی، میں ۱۹۶۷ء میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخل درس تھا، وہیں جماعت کے بیشتر طلبہ کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا کہ آئندہ سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لینا ہے، چنانچہ بعد رمضان ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء دیوبند پہنچا، امتحان داخلہ میں بحمداللہ نمایاں کامیابی حاصل کی اور مادر علمی نے ہمارے لیے اپنے آغوش وا کردیئے، نہایت صلاحیت مند، معروف اور بزرگ ہستیاں دارالعلوم کی خدمت سے وابستہ تھیں، جانشین شیخ الہند فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی شیخ الحدیث اور صدر مدرّس کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی کا گذشتہ رمضان میں انتقال ہو چکا تھا اور جانشین بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ، امین علومِ انوری فیض یافتہ از خانقاہ تھانوی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور سربراہ کاروانِ تحریکِ دیوبند اپنی دانائی، علم وحکمت اور تقویٰ کے ساتھ ادارے کا اہتمام سنبھالے ہوئے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کی بیداری میں معروف فرید العصر حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی کی جدوجہد جاری تھی۔

ابھی تک دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں جماعت بندی نہیں تھی، میرا داخلہ مختصر المعانی، شرح وقایہ اور مقامات حریری کی جماعت میں ہوا، اس طرح چار سال میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم مکمل ہوگئی، اس مدت میں جن اساتذہ سے کتابیں پڑھیں ان کا تذکرہ یہاں موجود ہے۔ فضیلت کے بعد بھی راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں چار سال تک تکمیلات کی مختلف جماعتوں میں داخل رہا۔ تفصیل کچھ اس طرح

داخلہ: ۱۹۶۸ء-۱۳۸۸ھ

فراغت از دورۂ حدیث: ۱۹۷۱ء-۱۳۹۱ھ

تکمیل ادب عربی: ۱۹۷۲ء-۱۳۹۲ھ

تکمیل کتابت (اردو عربی خطاطی) ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء

تکمیل افتاء نویسی: ۱۹۷۵ء-۱۳۹۵ھ

اس مدتِ تعلیم میں دارالعلوم میں تعلیم و انتظام میں بڑا سکون رہا، سوائے ایک اسٹرائک کے جو ۱۹۶۹ء میں تعلیمی مقاطعے کی صورت میں ہوئی، پھر دارالعلوم ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد اپنی خدمت اور تعلیمی سفر میں رواں دواں رہا، اپریل ۱۹۷۲ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ کی وفات ہوئی۔

واضح ہو کہ دارالعلوم دیوبند میں تقریباً سو سال تک مروّجہ انداز میں جماعت بندی نہیں تھی، عربی جماعت میں باضابطہ درجہ بندی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۷۰ء میں منظور کی، اور ۱۹۷۱ء میں اس کا نفاذ ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اسی سال یہ بھی طے ہوا کہ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد اگر طلبہ بعض علوم وفنون کی تکمیل تخصصات کے انداز میں کرنا چاہیں تو اس کے لیے اپنی پسند یا صلاحیت کے مطابق تکمیلات کے شعبوں میں اُن کے داخلے ہوں گے۔ اس طرح چند درجات وجود میں آئے:

۱- تکمیل فقہ و افتاء بنام افتاء نویسی ۲- تکمیل ادب عربی

۳- تکمیل تفسیر ۴- تکمیل معقولات

۵- تکمیل خوشنویسی (کتابت اردو، عربی)

۱۹۸۲ء کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی یا انتظامی طور پر کیا تبدیلیاں ہوئیں یہاں اس کا کوئی ذکر مقصود نہیں ہے۔

❁❁❁

مولانا بہاء الحسن صاحبؒ

دارالعلوم دیوبند کا پہلا سال، کتابیں تھیں: مختصر المعانی، شرح وقایہ، قطبی، نورالانوار، مقامات حریری اور عربی تمرین، شرح وقایہ کا درس حضرت مولانا بہاء الحسن صاحب سے متعلق تھا، مولانا ایک نامور اور نظم وانتظام پر مکمل کنٹرول رکھنے والے مشہور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا فخر الحسنؒ مرادآبادی کے صاحبزادے تھے، گول مٹول، سادہ مزاج اور ہنس مکھ جوان العمر، عام طور پر پابندی سے سبق میں حاضر رہنے والے، درس کا انداز بہت مناسب تھا، ترجمہ اور تشریح سہل انداز میں، نیک انسان تھے اور طلبہ سے شفقت کا معاملہ رکھتے۔

قدیم زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی روایت رہی ہے کہ صدرالمدرسین اساتذہ کرام کو ان کی صلاحیت اور کارکردگی کی بنیاد پر کتابیں سبق کے لیے دیتے، اسی بنیاد پر ان کی ترقی بھی موقوف ہوا کرتی تھی، اس لیے ایسا بھی ہوتا کہ صدرالمدرسین درسگاہوں میں جا کر سبق کے دوران بھی جائزہ لیا کرتے تھے، اساتذہ کا طرز تدریس، کتاب پر بحث وغیرہ کا کچھ حصہ سنتے، معلوم ہو جاتا کہ استاذ کی صلاحیت کیسی ہے، مطالعہ کتنا ہے اور کتاب کا حق درس کتنا ادا کرتے ہیں، ہمارے زمانے میں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ شیخ الحدیث کے ساتھ ساتھ صدرالمدرسین بھی تھے، اس لیے کبھی کبھی وہ اس طرح کا ''گشت'' لگایا کرتے تھے،

ان کی آمد پر اساتذہ میں بھی ہیبت رہتی، مگر قابل استاذ جو محنت اور مطالعہ کے بعد درس دیتے ہوں عام طور پر مرعوب نہیں ہوتے۔

دیکھا تھا اور اب تک یاد ہے کہ جب حضرت شیخ مولانا بہاء الحسن صاحب کی درسگاہ کے دروازے پر آکر کھڑے ہوئے اور سبق کا کچھ حصہ سنا تھا تو ہمارے استاذ مولانا بہاء الحسن صاحب پر بلا مبالغہ کپکپی طاری ہوگئی تھی۔

حضرت مولانا بہاء الحسن صاحب ابتدائی اور متوسطات کے درجات تک ہی ترقی پا سکے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی، حضرت کانپور شہر کے کسی اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے، وہیں ۱۹۷۸ء (غالباً) دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کرگئی، جناہ دیوبند آیا تھا اور یہیں ان کی تدفین ہوئی۔

ان کی اولاد میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے میرے اہل وعیال کے ساتھ ہمیشہ مادرانہ شفقت رکھی اور رہنمائی فرمائی، ہم ان کے ممنون ہیں اور ان کیلئے دعا گو۔

مولانا حامد میاں صاحبؒ

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں ایک نمایاں اور معروف نام ہے حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی کا جو طلبہ میں شیخ الادب کے لقب سے جانے جاتے تھے مگر حقیقت میں وہ صرف شیخ الادب نہیں تھے بلکہ جامع العلوم تھے، آج بھی عربی مدارس میں داخل نصابی کتاب ''نفحۃ العرب'' ان کی ہی تالیف ہے۔ ان کے فرزند تھے حضرت مولانا حامد میاں صاحب، اوران سے متعلق کتاب تھی ''نورالانوار''۔

مولانا حامد میاں کو بھی ان کے شاگرد اور دوسرے درجات کے طلبہ بہت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، اور خاص وجہ تھی ان کی درسگاہ اور ان کا انداز تدریس، ان کی درسگاہ احاطہ مولسری میں تھی، اور وہیں سے مطبخ کا راستہ بھی جاتا تھا، اس لیے خواہی نخواہی طلبہ وہاں سے ضرور گذرتے تھے، اور انداز تدریس بالکل نرالا، کبھی بیحد بلند آواز اور کبھی بالکل ست، قریب بیٹھنے والے طلبہ مکمل استفادہ کرتے اور دور بیٹھنے والوں کو تبرکات پر گذارا کرنا پڑتا، جب زور سے کوئی جملہ ادا کرتے تو مشہور تھا کہ مولسری کے درخت پر بیٹھے کوّے بھی اڑ جاتے ہیں، پان کھانے کے بیحد شوقین، سبق کے دوران اگر گلوری منھ میں ہوتی تو اس کے اثرات ان کے کپڑوں کے علاوہ قریب کے طلبہ پر بھی مرتب ہوتے۔

اور جب کتاب کی بحث میں مثالیں دینے کی ضرورت پیش آتی تو کتاب، رجسٹر، اگالدان، میز حتی کہ ان کے سر کی ٹوپی بھی زد میں آجاتی۔ بڑی تیزی سے

بولنے کے عادی تھے، اس لیے نہایت توجہ اور غور سے سننا پڑتا تھا، اس کے باوجود بہت سے الفاظ سننے والے کی پہنچ سے باہر ہو جاتے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر مسئلے کو بار بار دہراتے تاکہ طلبہ سمجھ سکیں، اس لیے قریب کے بیٹھنے والوں کو سبق پوری طرح سمجھ میں آجاتا تھا، مطالعہ کر کے پڑھاتے، اس لیے سبق ادھورا نہیں ہوتا۔

ان کی نجی اور خانگی زندگی نہایت غیر منظم تھی، ان کے والد بزرگوار کی عظیم شخصیت، ماہر علوم و بیحد منتظم و باوقار ہستی کے تناظر میں مولانا حامد میاں کی شخصیت اور حیثیت میں اتنا نمایاں فرق شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ ان کی وفات دیوبند میں ہوئی، اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے، ایک دماغی طور پر غیر متوازن لڑکا تھا اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے، البتہ لڑکیاں کئی ہیں۔

مولانا قمرالدین گورکھپوری

دارالعلوم دیوبند کے پہلے اور دوسرے سال میں حضرت مولانا سے تلمذ کا شرف حاصل رہا، پہلے منطق کی مشہور کتاب ''قطبی'' اور دوسرے سال جلالین شریف جلد اوّل مولانا سے پڑھنے کا موقع ملا، بلاشبہ کامیاب مدرس ہیں۔

گورکھپور (یوپی) کے رہنے والے، دیوبند سے فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں استاذ رہے، دوران طالب علمی امام المعقولات حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی (صدرالمدرّسین دارالعلوم دیوبند) کی خدمت میں رہ چکے تھے، اور ان سے علمی استفادہ کیا تھا، اس لیے استاذ نے ان کی کتابی صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرّس تقرر کرایا، سبق میں علامہ بغوی کے علاوہ علامہ بلیاوی کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے اب وہ علامہ قمرالدین کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں ان سے متعلق قطبی تھی، گھنٹے سے پندرہ منٹ پہلے سبق پورا کردیتے اور راقم الحروف کو سبزی، ترکاری ان کے گھر پہنچانے کی سعادت حاصل ہوجاتی، عرصۂ دراز تک ان کی یہ خدمت انجام دینے کا مجھے شرف حاصل ہے، ۱۹۶۹ء میں جلالین شریف کی جلد اوّل ان سے متعلق ہوئی، ان کا اس کتاب میں پہلا سال تھا اس لیے مطالعہ اور تحقیق کے بعد بڑی محنت سے پڑھاتے تھے، ہم طلبہ کو اس کا بہت

فائدہ حاصل ہوا۔

اُن دنوں مولانا کا معمول تھا کہ وہ عصر کے بعد حضرت مولانا معراج الحق صاحب اور مولانا عزیز احمد بی، اے کے ساتھ تفریح کے لیے جایا کرتے تھے، مولانا معراج الحق صاحب نہایت باوقار، سنجیدہ، اصولی اور کافی حد تک سخت مزاج تھے، وہ نائب مہتمم تھے، ۱۹۶۹ء کی مشہور اسٹرائک ان کی سخت گیری کے خلاف بھی ایک احتجاج تھی، جب ان کی نیابت ختم ہوئی تو مولانا قمر الدین صاحب نے ان کا ساتھ کم کر دیا، البتہ عزیز بی، اے صاحب نے اخیر تک رفاقت نبھائی۔

مولانا قمر الدین صاحب تقریر و تحریر کے میدان کے شہسوار نہیں ہیں، ۱۹۸۲ء میں دار العلوم میں انتظامی انقلاب آیا تو برسر اقتدار جماعت کے ساتھ وابستہ ہو گئے، چند سالوں کے بعد ان کو ناظم تعلیمات بھی بنایا گیا۔

اب درجۂ علیا کے مدرّس ہیں اور نائب شیخ الحدیث بھی، سلوک وتصوف کی راہ سے اپنا تعلق حضرت شاہ ابرار الحق ہردوئیؒ سے قائم کیا اور ان سے خلافت بھی حاصل کی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔

حضرت مولانا خورشید عالم دیوبندیؒ

ولادت: ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء

دارالعلوم دیوبند سے ابتدا ہی سے درس وتدریس سے وابستہ افراد میں سے حضرت مولانا محمد یاسین دیوبندی ہیں، جن کے صاحبزادے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ مؤلف ''معارف القرآن'' ہیں اور ان کا خانوادہ پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں اپنی علمی واصلاحی خدمات کے لیے معروف ہے۔

مولانا محمد یاسین کے ایک برادر حقیقی حضرت مولانا منظور احمد صاحب ہیں جن کے لڑکے حضرت مولانا ظہور حسن دیوبندی دارالعلوم دیوبند کے قدیم اساتذہ میں رہے، ان کے صاحبزادے حضرت مولانا خورشید عالم صاحب، جو گذشتہ پچاس سالوں سے دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی وانتظامی خدمات سے وابستہ رہے، بحمد اللہ یہ خاندان درس وتدریس، تالیف وتصنیف اور دعوت وتبلیغ میں سو سال سے زائد عرصے سے دارالعلوم دیوبند کے واسطے سے اور بلا واسطہ بھی ہندو پاک میں اپنی علمی خدمات اور روایات اکابر کی پاسداری میں معروف ہے، پاکستان کے موجودہ مفتی اعظم اور معروف محقق عالم حضرت مولانا تقی عثمانی زید مجدہٗ مولانا خورشید عالم کے عم زاد برادر ہیں۔

حضرت مولانا خورشید عالم صاحب ایک دیندار علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تو جلد ہی صرف ۵ رسال کی عمر میں تعلیم کا آغاز کردیا، ناظرہ قرآن کی تکمیل کے بعد

دارالعلوم دیوبند میں حفظ قرآن مکمل کیا، پھر اردو دینیات، فارسی اور ریاضی کی تعلیم بھی دارالعلوم سے حاصل کی۔ عربی درجات کی تکمیل بھی فرمائی۔ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء دورۂ حدیث سے فراغت پائی، بخاری شریف حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔

چند سالوں کے بعد ۱۳۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرّس عربی تقرر ہوا، اپنی علمی لیاقت اور ممتاز تدریسی صلاحیت وطریق تفہیم کی بنیاد پر بہت جلد ترقی کرتے چلے گئے، ابتدائی عربی کی کتابوں سے ہوتے ہوئے تقریباً تمام درجات میں تعلیم دی اور دورۂ حدیث کی امہات الکتب خاص طور پر بخاری شریف تک کی تدریس بحسن وخوبی انجام دی۔

راقم الحروف کو سب سے پہلے ۱۹۶۸ء میں مختصر المعانی پڑھنے کا موقع ملا، ۱۹۶۹ء میں ہدایہ جلد اوّل اور جلالین شریف نصف ثانی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

متوسط قد، خوبصورت چہرہ، گورا رنگ، باوقار اندازِ رفتار ونشست ان کی ظاہری شناخت رہی، ذہانت، تدبر، حسن انتظام، تدریسی لیاقت، نرم خوئی اور طلبہ سے مشفقانہ رویّہ ان کی سیرت کے نمایاں اوصاف۔ روایتی جلسوں کے خطیب نہیں مگر درسگاہ خاص طور پر دارالحدیث میں ان کا درس اور خطاب بلاشبہ بیحد ممتاز اور نمایاں رہا۔

دارالعلوم دیوبند کے تمام اساتذہ باصلاحیت اور بہت سی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں ایسے میں کسی خاص مدرّس کی کوئی نمایاں شناخت ہو تو وہ ایک غیر معمولی بات ہوگی، گذشتہ پچاس سالوں میں دیوبند کے فیض یافتہ طلبہ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ مختصر اور سہل انداز میں طلبہ کو کتاب سمجھانے، مشکل مسائل کو حل کرنے اور تدریس میں کون سے استاذ سب سے زیادہ ان کو یاد ہیں تو بلاتوقف وتردد اگر کوئی نام سب سے پہلے آئے گا تو صرف حضرت مولانا خورشید عالم صاحب کا نام ہوگا۔

اللہ ربّ العزت نے ان کو تدریس کا ایسا منفرد اسلوب عطا کیا تھا کہ تاحیات ان کا انداز اسی طرح برقرار رہا اور طلبہ کو اس انداز سے بیحد انسیت بھی تھی۔

مولانا دارالعلوم دیوبند کے انتظامی شعبوں سے بھی متعلق رہے، ناظم دارالاقامہ کی حیثیت سے بھی مقبول اور نائب ناظم تعلیمات کے طور پر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں یکتا۔

۱۹۸۲ء کے حادثے کے بعد وہ دارالعلوم وقف کے نائب مہتمم بنے، اس افراتفری اور پریشانی کے دور میں دارالعلوم دیوبند وقف کے جملہ داخلی انتظامات بڑی مستعدی اور جانفشانی سے انجام دیئے، غیر معمولی محنت اور تدریس کی ذمہ داری سے ان کی طبیعت علیل ہوگئی، دس سال تک انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی میں ان کی محنت دارالعلوم وقف دیوبند کے استحکام اور ترقی میں زرّیں دور ہے، تدریس کے علاوہ انتظام وانصرام اور حساب وکتاب کا اتنا حسین سلیقہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

حضرت الاستاذ کے دو صاحبزادے مولانا مفتی محمد عارف اور مولانا قاری محمد واصف فاضل دیوبند ہیں، اور کئی سالوں سے دارالعلوم وقف دیوبند میں مدرّس ہیں، وہ بھی اپنے والد کی طرح بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں اور تدریس میں مقبول بھی۔

وقف دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کی وفات کے بعد ان کو شیخ الحدیث نامزد کیا گیا تھا، ساتھ ہی دارالافتاء کے صدر مفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔

۲۰۱۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

❁❁❁

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

دارالعلوم دیوبند میں راقم الحروف کا پہلا سال اور جماعت تھی............ اس وقت جماعت بندی نہیں ہوئی تھی اس لیے اہم کتابوں کا نام لے کر کہا جاتا تھا کہ فلاں کتاب کی جماعت ہے یا فلاں کتاب کا سال ہے، کتابیں جو اس جماعت میں تھیں وہ اس طرح: مختصر المعانی، شرح وقایہ، مقامات حریری، قطبی اور عربی مشق کے لیے صف ابتدائی۔ اور طالب علم اگر چاہے تو شعبۂ کتابت میں خوش خطی۔ آج کے تناظر میں اسے سال پنجم مان لیں۔ یہ ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔

ہر کتاب کے لیے الگ استاذ، مختصر المعانی مولانا خورشید عالم صاحب سے متعلق، شرح وقایہ مولانا بہاء الحسن صاحب سے اور قطبی مولانا قمر الدین صاحب کے پاس، باقی دو گھنٹے حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی سے متعلق، تمام کتابوں کے نام سنے ہوئے اور مانوس تھے، البتہ صف ابتدائی (عربی) نئی چیز تھی، معلوم ہوا کہ اس میں عربی زبان کی مشق ہوگی، پھر باضابطہ درس کا آغاز ہوا، مقامات حریری کے سبق میں نہایت نفیس اور سفید پوش استاذ کی حیثیت سے مولانا وحید الزماں تشریف لائے، ابتدائی کلمات اور عربی زبان وادب سے متعلق کچھ معلومات کا ذکر واضح الفاظ، شستہ اسلوب اور نہایت متانت وسنجیدگی کے انداز میں، مبتدی طالب علم بیحد متاثر ہوا، پھر صف ابتدائی کے گھنٹے میں وہی پروقار شخصیت مزید متاثر کرتی ہوئی۔ بتایا گیا کہ تمام طلبہ کاپی اور قلم لے کر آئیں، ان کو جملے لکھائے جائیں گے، اُن کا ترجمہ ہوگا، مشق

ہوگی، اور پھر زبانی ان جملوں کی ادائیگی ہوگی۔ (یعنی تحریر کے ساتھ محادثہ بھی)

دارالعلوم دیوبند میں بہت پہلے سے تعلیم کی ترتیب میں یہ طریقہ رہا ہے کہ جس درجہ میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہو اس کی دو جماعتیں کردی جائیں، ضرورت پڑنے پر ایک ہی جماعت کی تین ترتیب بھی، البتہ دورۂ حدیث میں تمام طلبہ ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں، آج سے ۴۵ رسال قبل بھی ہماری جماعت کی دو ترتیب ہوگئی، اور صف ابتدائی بھی دو گھنٹوں میں، ایک گھنٹے میں حضرت مولانا خود درس دیتے اور دوسری جماعت میں اپنے ایک لائق عربی داں شاگرد مفتی ابوالقاسم بنارسی (موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے ذریعہ سبق دلاتے، حسن اتفاق ہمارا گھنٹہ حضرت ہی سے متعلق رہا۔ اس وقت تک کوئی نصابی کتاب متعین نہیں تھی، مگر حضرت الاستاذ نے اپنے طور پر کتاب مرتب کرلی تھی، جو طبع نہیں ہوئی تھی وہی ہمیں روزانہ ایک سبق لکھوادیتے اور اس کی مشق تقریری وتحریری کراتے، بعد میں یہی کتاب **"القراءة الواضحة"** کے نام سے تین حصوں میں طبع ہوئی اور دیوبند کے علاوہ ملک کے بیشتر مدارس میں داخل نصاب بھی ہے۔

طلبۂ دارالعلوم میں عربی زبان وادب عام کرنے، شعور میں پختگی پیدا کرنے اور تقریر وتحریر میں مشق کے لیے ایک عربی انجمن "النادی الادبی" کے نام سے حضرت مولانا نے پہلے ہی قائم کر رکھی تھی، جس میں عربی کی تینوں جماعتوں "صف ابتدائی"، "صف ثانوی" اور "صف نہائی" کے طلبہ کا حصہ لینا لازم تھا، چنانچہ احقر نے بھی اس میں حصہ لیا اور عربی زبان سیکھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے بیحد دلچسپی پیدا ہوگئی، پھر اگلے سال جب جلالین، ہدایہ اوّلین کی جماعت کا طالب علم بنا تو "صف ثانوی" کے سبق میں شریک رہا۔ جس کا درس بعد نماز مغرب ہوا کرتا تھا، اور حضرت مولانا خود درس دیتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سال سے بحمد اللہ امتحان سالانہ میں تمام پرچے عربی

زبان میں لکھنے کی قدرت حاصل ہوگئی اور بلاشبہ یہ صلاحیت حضرت الاستاذ کی محنت، طرز تدریس اور حوصلہ افزائی کی بدولت ہی حاصل ہوسکی۔

ان دو سالوں میں عربی سے دلچسپی اور النادی الادبی سے وابستگی نے میری زندگی کو ایک نئی جہت عطا کردی اور گوکہ آئندہ دو سالوں تک حضرت مولانا سے متعلق کوئی نصابی کتاب درس میں نہیں تھی، مگر عربی سے رغبت وشوق میں کوئی کمی نہیں آئی، النادی سے وابستگی جو برقرار تھی، پھر دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد سب سے پہلے ترجیحاً میں نے ''تکمیل ادب عربی'' میں داخلہ لیا، دارالعلوم دیوبند کے تذکرے کے ذیل میں عرض کرچکا ہوں کہ دارالعلوم میں باضابطہ جماعت بندی کا آغاز ۱۹۷۱ء سے ہوا ہے، اسی سال تکمیل کے شعبے قائم ہوئے، گویا تکمیل ادب عربی کے قیام کے دوسرے سال ہماری جماعت تھی، میرے ساتھیوں میں مولانا مکرم الحسینی مونگیری، مولانا الطاف الرحمن اعظمی اور مولانا عبدالوحید واحد فیاضی بھی تھے۔

راقم اس وقت تک حضرت مولانا سے زیادہ قریب نہیں تھا مگر النادی الادبی میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے لامحالہ طور پر حضرت ضرور پہچانتے ہوں گے، بالآخر جب تکمیل ادب میں داخل ہوا تو نصابی سرگرمیوں کے علاوہ النادی کے پروگراموں (تقریری وتحریری) میں ہمہ تن مشغول ہوگیا، مولانا نے النادی کا نائب معتمد بھی متعین فرمایا، اور دو قلمی رسالوں کی ادارت بھی سپرد کردی۔

واضح ہو کہ ابتدا میں تکمیل ادب کے تمام گھنٹے اور جملہ کتابیں صرف حضرت مولانا وحید الزماں صاحب سے ہی متعلق تھیں، صبح کے چاروں گھنٹے وہ خود پڑھایا کرتے، شام کا ایک گھنٹہ مطالعہ کے لیے مخصوص تھا اور ترجمہ وتمرین کے لیے، اسی دوران حضرت مولانا کے معاون کے طور پر ایک نئے استاذ کا تقرر ہوا تو مولانا نے شام کا ایک گھنٹہ ان سے متعلق کردیا جس میں املا، اور نحو کی مشق کی ذمہ داری تھی،

البتہ وہ گھنٹہ طلبہ کے لیے اختیاری تھا، حاضر ہوں یا نہ ہوں، چند نمایاں طلبہ اس میں شریک نہیں ہوتے، راقم الحروف بھی ''اختیاری'' کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ یہ استاذ تھے مولانا ریاست علی صاحب بجنوری، وہ اردو کے ماہر ادیب اور قلمکار تھے، زودنویس اردو عربی کے خطاط بھی تھے اور عربی زبان وادب سے مناسبت تھی، بعد میں ماشاء اللہ دارالعلوم دیوبند میں درجۂ علیا کے استاذ رہے اور بہترین منتظم بھی۔

بلاشبہ تکمیل ادب کی ابتدا کے پانچ سال بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں اور تکمیل کے طلبہ خوش نصیبی کے مالک جن کی سبھی نصابی کتابیں یا زیادہ تر کتابیں حضرت الاستاذ ہی پڑھاتے، ان تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں بلکہ امتیازات کے ساتھ درس دیتے رہے جن کی بدولت حضرت الاستاذ دیوبند اور ملک میں ''شیخ الادب'' کہلائے۔

حضرت مولانا اپنی تمام تر انفرادی خصوصیات کے ساتھ عام ارکان ''النادی الادبی'' اور خاص طور پر تکمیل کے طلبہ کی تربیت، ذہن سازی اور سلیقہ مندی پر زور دیتے، عربی زبان و ادب سے تعلق، لکھنے، پڑھنے اور بولنے کا شعور پیدا کرتے رہے، وہ ''رجال سازی'' کے معروف کردار کے ساتھ ان طلبہ کی نگہداشت فرماتے۔

ان کی خوبیوں میں صفائی ستھرائی، سلیقہ مندی، وقت کی پابندی، تعلیم وتربیت پر توجہ اور عربی ماحول پیدا کرنے جیسی خصوصیات رہیں، ان کی ظاہری زندگی ان تمام باتوں کی روشن مثال، طلبہ کو بھی انھیں باتوں کی تلقین اور بسا اوقات عملی تربیت بھی، حوصلہ افزائی اور میدان حیات میں ترقی کی راہوں کی نشاندہی اضافی کمال تھا۔

تکمیل کے سال سے ۱۹۸۰ء تک حضرت مولانا کی رہنمائی، تربیت اور حوصلہ افزائی نے راقم الحروف کو اس مقام تک پہنچا دیا جہاں حضرت الاستاذ نے خود سراہا اور پسندیدگی کا موقع بہ موقع اظہار بھی فرمایا، احقر کا اردو اور عربی خط چوں کہ اچھا تھا اس لیے حضرت نے عربی خطاطی کی مشق بھی کرائی اور رسالوں کی کتابت، طلبہ اور

النادی کے اعلانات کی ترقیم وتحسین کی ذمہ داری بھی سپرد کی، بعد میں انھوں نے رسالہ ''دعوۃ الحق'' اور ''الکفاح'' کی مکمل کتابت بھی احقر سے متعلق کردی، خطاطی کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اس لیے عربی کتابوں اور رسائل ومختلف تحریروں کے سہارے خود بھی عربی کے تمام خطوط پر قدرت حاصل کرلی، خط رقعہ اور خط کوفی میرا امتیاز بن گیا، اور یہی خوبی میرے لیے دارالعلوم دیوبند میں خدمت کا ذریعہ بن گئی، جب ۱۹۷۶ء میں مولانا کی نگرانی میں ''الداعی'' عربی پندرہ روزہ کا اجراء ہوا تو اپنے لیے انھوں نے دو معاون طلب کئے، دوسرے معاون کے طور پر میرا تقرر ہوگیا جو ۱۹۸۲ء تک جاری رہا۔

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانہ ضلع مظفرنگر میں ۱۷ رفروری ۱۹۳۰ء کو ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے، والد مولانا مسیح الزماں اور دوسرے چچا دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں۔ خاندان کے کچھ افراد حیدرآباد (دکن) میں مقیم ہوئے، مولانا وحید الزماں کی ابتدائی تعلیم کیرانہ میں ہوئی، مزید تعلیم اور خاص طور پر عربی زبان وادب کے لیے حیدرآباد چلے گئے، جہاں اپنی رغبت اور ذاتی شوق سے ایک عربی کے ماہر عالم علامہ محمد المامون الدمشقی سے عربی زبان اور گفتگو کا سلیقہ سیکھا، نصابی کتاب کی بجائے ان سے موقع بہ موقع عربی زبان، اسلوب اور گفتگو کے سلسلے میں استفادہ کیا، وہاں کی لائبریریوں اور عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ اور حل کے ذریعہ عربی زبان میں یک گونہ مہارت حاصل کرلی۔ باضابطہ طور پر نصابی کتاب کی تکمیل کے لیے دیوبند آئے، جہاں کے ماحول میں عربی پر قدرت کے لحاظ سے وہ یکتا تھے۔

مولانا نے دارالعلوم سے فضیلت کی تکمیل کی، پھر دہلی میں مقیم رہے، مگر ۱۹۵۸ء میں مستقل طور پر دیوبند آگئے، جہاں عربی کی تعلیم وتمرین کے لیے اپنا ایک ادارہ ''دارالفکر'' قائم کیا، وہیں طلبہ کو عربی زبان سکھاتے رہے، ان کے بعض

احباب بھی ان کے ساتھ رہے، اس لیے ایک رسالہ "القاسم جدید" بھی جاری کیا، حلقۂ دیوبند اور اربابِ حل وعقد دارالعلوم میں ان کی عربی دانی کی شہرت تھی، اس لیے ان پر ذمہ داران کی خصوصی توجہ تھی۔

۱۹۶۰ء کے بعد کا یہ وہ زمانہ ہے جب عرب دنیا میں مادّی عروج شروع ہو چکا تھا، ظاہر ہے کہ عربی زبان وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ عرب سربراہان یا علماء و محققین کی آمد بھی برصغیر ہند میں شروع ہوئی اور ہندوستان کے دینی مدارس سے ان کے رابطے بڑھے، علمی اور ثقافتی تبادلوں کے سلسلے بھی استوار ہوئے، ازہر الہند دارالعلوم دیوبند بھی ایک عربی دینی ادارہ تھا، اس لیے علماء اور وفود کی آمد و رفت یہاں بھی بڑھی، دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب پر مہارت رکھنے والے ماہرین ہمیشہ موجود رہے ہیں، جنھوں نے عربی میں کتابیں لکھیں، ترجمے کئے، عربی میں اشعار بھی کہتے تھے، عربی کی تفہیم مشکل نہیں تھی، مگر عربی میں بولنے اور خطاب کرنے والے نہیں پائے جاتے تھے، اور اب ضرورت تھی کہ حلقۂ دارالعلوم میں ایسے افراد بھی تیار ہوں، اس لیے ارکان شوریٰ اور خاص طور پر مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ کی طلب پر حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کا تقرر دارالعلوم میں ۱۹۶۳ء میں بحیثیت عربی مدرّس ہوا، پھر استاذ محترم کے بقول حضرت مہتمم صاحب نے ان کو دارالعلوم کے احاطے میں عربی زبان کا ماحول بنانے کی ہدایت دی اور اس سلسلے میں ان کے ہر مشورہ پر عمل کی یقین دہانی کرائی۔

اب دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کے تئیں وہ انقلابی دور شروع ہوا جو زرّیں دور کہا جاسکتا ہے، ابتدا ہوئی اور چند سالوں میں مولانا کیرانوی نے پوری فضا میں اپنی عبقری خصوصیت کے سائے دراز کردیئے۔

اور مکمل طور پر مختارانہ انداز میں حضرت نے عربی زبان وادب کی تدریس،

تمرین، محادثہ اور خطاب کا جو ماحول تیار کیا وہ عروج کا زمانہ ہے، حسن اتفاق ان کے اس عروج کے زمانے میں راقم الحروف ایک طالب علم اور مشاہد کی حیثیت سے موجود رہا ہے، ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۷ء تک حضرت نے خود کو صرف اسی کے لیے وقف کر دیا، اپنی معروف زمانہ کتابوں اور قوامیس کی تالیفات بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ اور ملک و بیرون ملک سیکڑوں ایسے تلامذہ اور مستفیدین کی ٹیم تیار کر دی جو آج تک دار العلوم اور اپنے استاذ کی شہرت و عظمت کی علامت ہیں۔

مولانا کیرانوی کو قدیم نظم اور جدید نثر کا ایک عظیم ماہر اور ممتاز شخصیت ہونے کا فخر حاصل ہے، اور یہ بات ایک اٹل حقیقت ہے کہ برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش میں کوئی بھی عربی داں عربی اسلوب میں گفتگو اور خطاب میں ان کا ہمسر نہیں ہے، خواہ زبان و ادب کے دیگر گوشوں اور تالیفات کے لحاظ سے اور لوگ بھی ان سے نمایاں ہوں۔

اجلاس صدسالہ ۱۹۸۰ء سے دو سال قبل تعمیرات میں اور اجلاس کے بعد دار العلوم میں ''اصلاح'' کے عنوان سے انقلاب اور اقتدار کی منتقلی میں حضرت الاستاذ اس طرح مشغول ہوئے کہ ان کی امتیازی شان (عربی زبان و ادب کے تناظر میں) میں کمی آگئی، اور اخیر عمر میں تو ان اصلاح پسندوں نے حضرت کے خلاف ہی مورچہ کھول دیا، طرح طرح کے الزامات اور بالآخر جذبات کی شدت اور دماغی عدم توازن کی غلط تہمتیں عائد کر دیں اور اسی ''اصلاح شدہ'' دار العلوم سے بے دخل کر دیا۔

۱۵؍اپریل ۱۹۹۵ء میں ان کی وفات ہوئی، دیوبند میں مدفون ہیں۔ ان کی وفات پر تنظیم ابنائے قدیم کا ایک تعزیتی اجلاس ۲۱؍اپریل ۱۹۹۵ء میں غالب اکیڈمی دہلی میں منعقد ہوا، جس میں ان کے ایک ادنیٰ شاگرد (راقم الحروف) کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحبؒ

دیوبند میں ایک طویل عرصے تک دارالعلوم کے علاوہ ایک قابل ذکر مدرسہ ہوا کرتا تھا، مدرسہ اصغریہ دیوبند، جہاں حفظ و ناظرہ کے علاوہ عربی درجات سال چہارم تک کی تعلیم ہوا کرتی تھی، اب نہ مدرسہ اصغریہ کا وہ علمی مقام رہا، نہ اکیلے یہ دو مدارس، اب دیوبند میں بے شمار تحفیظ القرآن اور ابتدائی عربی کے مدارس ہیں۔

مدرسہ اصغریہ دراصل ایک جلیل القدر عالم اور استاذ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب کی یادگار ہے، حضرت مولانا اصغر حسین میاں صاحب کا خاندان بھی دیوبند کے اصحاب علم وتقویٰ کا خاندان کہا جاسکتا ہے، حضرت میاں صاحب کے کئی صاحبزادے درس وتدریس اور تربیت وسلوک سے وابستہ رہے ہیں۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحب انھیں محدّث دارالعلوم میاں اصغر حسینؒ کے صاحبزادے تھے، ان سے ہم نے ہدایہ جلد ثانی کی تعلیم حاصل کی۔

علامہ ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کی وفات (۱۹۶۷ء) کے بعد نظامت تعلیمات کی ذمہ داری میاں اختر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی جو اُن کی حیات تک ان سے متعلق رہی۔

تدریس میں ان کا ایک خاص طریقہ رہا۔ عبارت کا ترجمہ اور مختصر تشریح، لیکن

اتنی دلنشیں کہ ہر طالب علم سمجھ لے، تطویل اور تقریر دونوں سے احتراز، اور اسباق میں بیحد اصول پسند، درسگاہ، کتاب، استاذ یا درس سے لاپرواہی قطعاً پسند نہیں کرتے تھے، غیر حاضری پر سخت تنبیہ، زیادہ غیر حاضری پر سزا، وہ عصا رکھا کرتے تھے جسے وہ ''تنبیہ الغافلین'' کہتے، اسی سے غفلت کرنے والوں کو سزا ملتی، مگر محنتی اور حاضر باش طلبہ سے بیحد خوش، ان کے لیے شفقت و محبت کا اظہار، سبق میں کبھی کبھار طلبہ کو نصیحت بھی فرماتے اور خوش ہوتے تو لطائف یا بعض دلچسپ واقعات بھی سناتے۔

ہدایہ اخیرین کا سبق بھی حضرت سے متعلق تھا اور عرصۂ دراز تک اس کا درس دیتے رہے۔ نظامت تعلیمات میں اصول و ضوابط کے سخت پابند۔

حقیقت میں حضرت میاں صاحب ایسے صاحب تقویٰ بزرگ تھے جنھیں ولی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ

۱۹۶۹ء میں میبذی، ۱۹۷۰ء میں مشکوٰۃ شریف جلد ثانی اور ۱۹۷۱ء (۱۳۹۱ھ) میں موطا امام مالک، یہ تین کتابیں حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب سے پڑھیں۔

قد نکلتا ہوا، بدن متوازن، خوبصورت شکل وصورت، رنگ گورا، داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید لیکن جوان، ہنسنے کا انداز بھی باوقار، بہترین انداز گفتار، ہر ہر لفظ جدا جدا، ایسا ممکن نہیں کہ کتاب پڑھائیں اور طالب علم کو سنائی نہ دے، یا سمجھ میں نہ آئے، عام طور پر اس وقت سال ششم اور ہفتم کی ایک جماعت میں سو کے قریب طلبہ ہوتے تھے، آواز بلند تھی، اس لیے بغیر مائک کے بھی درسگاہ کے ہر گوشے تک پہونچ جاتی۔ سنا جاتا تھا کہ وہ علم ہیئت اور فلسفہ کے ماہر ہیں، طلبہ کو صرف نصابی کتاب اور اس کے مشمولات سے دلچسپی ہوتی ہے اس لیے ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوسکا۔

البتہ مشکوٰۃ جلد ثانی پڑھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا تھا کہ مولانا کو علم حدیث سے بھی بڑی مناسبت ہے، عبارت کا ترجمہ ومطلب اور حسب ضرورت تشریح کے علاوہ گاہے بہ گاہے تفصیل سے کلام بھی فرماتے، اس لیے ان کا درس طلبہ میں بیحد مقبول تھا۔

ظاہری شکل وصورت اور متانت ووجاہت سے بلاشبہ وہ کسی عظیم الشان دینی ادارے کے شیخ الحدیث لگتے تھے، بالآخر وہ ۱۹۷۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے

شیخ الحدیث اس طرح متعین ہوئے کہ وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

ضلع بلند شہر کے رہنے والے، اور مشہور عالم ومحدث حضرت مولانا بشیر احمد خاں نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے برادر خورد، دیوبند میں تقرر ہوا اور ابتدائی درجات سے اعلیٰ درجات تک ترقی پائی، اپنے طرز تدریس، باوقار انداز اور رکھ رکھاؤ سے طلبہ میں بھی مقبول تھے اور انتظامیہ میں بھی، اس لیے انھیں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے نائب مہتمم بھی بنایا۔

مولانا فخر الدین مرادآبادی شیخ الحدیث کی رحلت (۱۹۷۲ء) کے بعد دارالعلوم دیوبند میں چند نامور اساتذۂ حدیث موجود تھے، ان میں سے حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیوبندی کو شیخ الحدیث کا منصب عطا کیا گیا، مگر ان کے انتقال (۱۹۷۷ء) کے بعد انتظامیہ کے سامنے یہ دشواری پیش آئی کہ کن کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا جائے، اس دوران حضرت حکیم الاسلام نے بخاری شریف کا درس بھی دیا۔ پھر مجلس شوریٰ پر اس تعین کو ٹال دیا گیا، اس وقت باصلاحیت اور سینئر اساتذہ میں سے حضرت مولانا فخر الحسن مرادآبادی صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند، حضرت علامہ محمد حسین بہاری اور حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی بھی موجود تھے جو قدیم ترین مدرسین تھے، اور دورۂ حدیث کی امہات الکتب (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی) کا درس بھی دے رہے تھے، اور ان کو شیخ الحدیث بنایا جاسکتا تھا، اور غالباً اس کی کوششیں بھی کی جارہی تھیں، مگر مجلس شوریٰ کے سامنے جب انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو بڑی دشواری ہوئی، ایک تجویز یہ بھی تھی کہ بخاری شریف جلد اوّل اور ثانی کو اساتذہ میں تقسیم کردیا جائے اور شیخ الحدیث کے بطور کسی کو نامزد نہ کیا جائے۔

پھر تمام خدشات اور اختلافات کو ختم کرنے کے لیے مجلس شوریٰ وارباب حل وعقد نے ایک نیا نام تجویز کیا جس کا وہم وگمان بھی نہیں تھا اور وہ نام تھا حضرت مولانا

نصیر احمد خاں صاحب کا، اس دن سے تیس سال سے زائد کا عرصہ ہوگیا وہ اس عہدے پر فائز رہے، صحت میں کمی بھی آئی اور ضعف بھی، مگر بدستور وہ درس بخاری میں مشغول رہے۔

۱۹۸۲ء کے انقلاب میں باوجودیکہ وہ حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے معتمد اور مقبول آدمی گردانے جاتے تھے، اس لیے عرصۂ دراز سے نائب مہتمم چلے آرہے تھے، اچانک انھوں نے قابض گروپ کے ساتھ اپنی وفاداری اور تعلقات استوار کرلئے، اس کے بعد سے ہمارا اُن سے رابطہ نہیں رہا، اس لیے ان سالوں میں ان کی تدریسی وغیر تدریسی مصروفیات کا قطعی اندازہ نہیں۔

وہ چونکہ خطیب نہیں تھے اس لیے عام طور پر دینی اجلاس میں کم ہی شریک ہوتے، تحریر وتصنیف کا کوئی نمونہ بھی موجود نہیں ہے، مگر کم وبیش بیس ہزار سے زائد طلبہ نے ان سے علم حدیث حاصل کیا ہے یہی ان کی سب سے بڑی خدمت ہے اور ان کے تلامذہ ملک وبیرون ملک علمی، دینی وتدریسی خدمات میں مشغول ہیں۔

ان کی اولاد میں سند یافتہ عالم دین مولوی یا فاضل نہیں ہیں مگر سب نہایت نیک نفس اور شریف الطبع ہیں۔

۴؍فروری ۲۰۱۰ء کو دیوبند میں انتقال ہوا، مزار قاسمی میں مدفون ہیں۔

شیخ الحدیث
حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ مرتب ہو، یا دارالعلوم کے فرزندان کی امتیازی خصوصیات وخدمات کا تذکرہ تحریر کیا جائے تو لامحالہ ایک نام سب سے پہلی فہرست میں ضرور آئے گا، اور وہ نام ہے امام العصر فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کا، کشمیر کے ایک گمنام خطے کو جنھوں نے معروفِ عالم کردیا، ایک غیر معروف خاندان کو دوام بخش دیا، اور دارالعلوم دیوبند کو علم حدیث کے تناظر میں گذشتہ دو صدیوں میں امتیازی مقام عطا کردیا، یادداشت اور قوت حافظہ کے افسانوی کرداروں کو حیاتِ جاودانی دے دی۔

علامہ کشمیریؒ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری ہیں، ۱۹۷۰ء میں ان سے راقم الحروف نے مشکوٰۃ جلد اوّل کا درس حاصل کیا، دورۂ حدیث کے سال میں ان سے طحاوی شریف پڑھی، ان کا درسِ جلالین طلبہ میں بیحد مقبول ومشہور تھا، انداز درس دلچسپ، نطق وگویائی کے گویا امامِ وقت، ایک ایک لفظ اور ہر جملہ واضح، جب درس دے رہے ہوں ہر ہر طالب علم ان کی جانب ہی متوجہ، تدریس میں بھی خطابت کے جوہر نمایاں، اور خطابت میں فصاحت وبلاغت، طلاقت لسانی، بداہت ولطافت اور متاثر کن اسلوب ان کا خصوصی امتیاز، جوش وخروش ہمہ وقت

ان کا رفیق، تقریر کا ایسا ملکہ کہ مجمع کو جس نہج پر لے جانا چاہیں لے جائیں، مفروضہ خیال کو بھی اپنی قوت گویائی اور انداز خطابت سے حقیقت بنادینے کا سحر، اور حقیقت کو دل و دماغ میں پیوست کر دینے کا ہنر، مجمع کو اپنے خطاب سے اپنی گرفت میں لینے کی قوت، یہ سب اوصاف ان کی تقریر کا ادنیٰ حصہ ہیں۔ کتاب کی تدریس میں بھی یہ خوبیاں نمایاں۔

طالب علمی کے زمانے میں بارہا دیکھا ہے کہ جہاں کسی جگہ ان کی تقریر کا اعلان ہوا خواہ وہ سیرت کا اجلاس ہو یا سیاست کا، طلبہ کا ہجوم جوق در جوق پہلے سے حاضر ہونے کا مشتاق، اور جب ان کی تقریر ختم ہوئی گویا اجلاس برخاست، ان دنوں ان کی تقریر صرف بیس پچیس منٹ کی ہوا کرتی تھی، دار العلوم میں کوئی اجلاس ہو یا دیوبند کے کسی محلے میں، طلبہ کے علاوہ اہل علم کی حاضری اجلاس کی کامیابی کی ضمانت ہوتی اور مولانا انظر شاہ کشمیری کا بیان ہو تو وہاں ان افراد کی حاضری لازمی۔

ان تقریروں میں ابتدا ہی سے مکمل جوش و خروش اور روانی کے ساتھ ان کا بیان شروع ہوتا اور اختتام ایسے موقع پر کہ شائقین مزید کے طلبگار نظر آتے۔

مولانا انظر شاہ نے علامۃ العصر حضرت محدث کشمیریؒ کے گھر میں ۱۹۲۸ء میں اپنے وجود کا احساس کرایا، علمی خاندان اور علامہ کے تلامذہ و عقیدت مند اُن کے جاں نثار، اس لیے مولانا کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں ان چیزوں کا نمایاں اثر ہوا، سب سے چھوٹے فرزند تھے اس لیے سب کے لاڈلے بھی، ابتدائی دینیات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عصری علوم کے حصول کا شوق ہوا تو دہلی کا سفر کیا جو تقسیم ہند سے پہلے علوم و فنون اور ان کے ماہرین کا مرکز تھا، اس لیے طلبہ کے لیے وہاں کے اصحابِ کمال اور اہل علم و دانش سے استفادے کی کشش موجود تھی، وہاں چند سال گذارے مگر ۱۹۴۷ء میں دہلی ایک بار پھر اجڑی، افراتفری کا دور آیا تو

واپس دیوبند آ گئے، مگر عصری علوم کی لگن باقی تھی، اس لیے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات دیئے اور کامیاب ہوئے، مگر دیوبند آنے کے بعد وہاں کے ماحول کے مطابق دینی علوم کی جانب متوجہ ہوئے، حضرت علامہ کے شاگردوں نے اپنا فریضہ ادا کیا اور تعلیم کے لیے ماحول فراہم کیا، خاص طور پر شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی نے ایک اتالیق کی طرح ابتدائی عربی کی تمام کتابیں پڑھائیں، دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے تو نسبت انوری کے علاوہ ان کی ذاتی لیاقت اور محنت و کاوش نے نمایاں کامیابی دی، ۱۹۵۲ء میں فراغت حاصل کی اور دارالعلوم دیوبند ہی میں عربی مدرّس کی حیثیت سے ایک نیا سفر شروع کر دیا جو کامیابی و کامرانی کی نئی منزلوں تک منتہی ہوا۔

اس دوران ذرائع آمدنی بھی محدود تھے، مگر ہمت نہ ہاری، خطابت معاون ثابت ہوئی، قلم نے ساتھ دیا، مشہور عربی تفاسیر کے ترجمے شروع کئے، تصنیف و تالیف میں بھی جوہر نمایاں ہوئے، ملکی و غیر ملکی سیاست سے بھی دلچسپی رہی، ملّی و قومی رہنمائی کے لیے جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، اور جمعیۃ کے مقامی صدر ہونے کے علاوہ ایک فعال کارکن اور صائب الرائے مشیر بھی رہے، ملک کے مختلف علاقوں میں جمعیۃ کے اسٹیج سے یادگار تقریریں کی، جو ۱۹۸۰ء تک جاری رہیں۔ پھر دارالعلوم کے حالات بدلے تو مولانا انظر شاہ کشمیری جمعیۃ سے نہ صرف الگ ہوئے بلکہ اس گروپ کی دارالعلوم پر زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو گئے، تقریر و تحریر میں حقائق بیان کرنے سے بھی نہیں چوکے۔

اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند سے قبل ہی دورۂ حدیث کی بخاری شریف جلد ثانی ان سے متعلق کی گئی تو اب درسِ حدیث میں ان کی شہرت ہوئی، پھر وہ اس علم میں مکمل طور پر مشغول ہوئے اور اپنی محنت و صلاحیت اور شوق مطالعہ سے

نمایاں مقام حاصل کیا۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے قیام کے وقت سے ہی اس ادارہ کی ترقی واستحکام میں اس طرح فنا ہوگئے کہ بخاری شریف کے درس کے علاوہ اس کے لیے مالی سرمایہ کی فراہمی کو تمام تر مخالفتوں کے باوجود اپنا مشن بنالیا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں اسفار کئے، اصحاب خیر اور ہمدردان سے رابطے قائم کئے، بیرون ملک مخلصین دارالعلوم کو متوجہ کیا اور بالآخر اپنی ذاتی کوششوں سے دس سال کے اندر دارالعلوم کے لیے ایک وسیع قطعہ اراضی کی خریداری مکمل کی، مشن جاری رہا اور تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا، دارالعلوم وقف دیوبند مرکزی جامع مسجد سے نکل کر اپنی عمارتوں میں منتقل ہوگیا، پھر رفتہ رفتہ تمام ضروری عمارتوں کی تکمیل بھی ہوئی، دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت حضرت والا کی محنتوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ طلبہ کی زیادتی کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ بھی ہوتا رہا اس لیے ابھی تعمیرات کی ضرورتیں بھی باقی ہیں۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے ابتدائی سالوں میں جدوجہد اور تعمیرات حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری کی خدمات کی دَین ہے۔

اس کے ساتھ ہی بحیثیتِ صدرالمدرّسین و ناظم مجلس تعلیمی دارالعلوم وقف دیوبند انھوں نے تعلیمی معیار بلند کرنے اور طلبہ کی تعلیم وتربیت کی منصوبہ سازی میں اس طرح لگن سے کام کیا کہ برصغیر ہندوپاک و بنگلہ دیش میں ادارے کی تعلیمی حیثیت کو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، طلبہ کی ایک بڑی تعداد یہاں سے کسب فیض کے لیے بیتاب رہتی ہے، خود دورۂ حدیث میں سات سو سے زائد طلبہ کا داخلہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

دارالعلوم وقف کی تعمیراتی ضروریات کی کافی حد تک تکمیل ہوجانے اور اہل خیر

مسلمانوں و ہمدردانِ دارالعلوم کی توجہ کے بعد حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری نے اپنا ایک دوسرا ادارہ ''معہد الانور'' کے نام سے چند سال قبل شروع کیا، جو اَب ''جامعۃ الامام انور شاہ کشمیری'' کے نام سے موسوم ہے، وہاں درجۂ حفظ کے علاوہ تمام درجاتِ عربیہ کی تعلیم کا نظم ہے، اسی کے ساتھ ایک تحقیقی و تصنیفی اکیڈمی بھی جاری ہے جہاں سے کئی کتابوں کے ترجمے یا تعلیق و تحشیہ کی تکمیل ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا کشمیری کو مراجع الکتب کے علاوہ جملہ دینی و تحقیقی کتابوں کے مطالعہ کا بیحد شوق تھا اور وقت کی فراوانی کی وجہ سے اس ذوق وشوق کی تکمیل بھی ہوجاتی، اخبارات ورسائل کا مطالعہ روزمرہ کا معمول بلکہ عادت ثانیہ۔ چونکہ سیاست سے بھی ان کا تعلق رہا اس لیے ملکی، غیر ملکی وملّی وقومی مسائل سے آگہی ان کی ضرورت بھی، بعد نماز عشاء ان کی مجلس ہوتی رہی جہاں اساتذہ، اہل علم و دانش کا اجتماع ہوتا، بسا اوقات اہل سیاست بھی، اور پھر ملکی وملّی مسائل پر بحث و مذاکرہ، اس مجلس میں حسب عادت اکابر دیوبند کا ذکر بھی، اور چوں کہ حافظہ موروثی ہے اس لیے تاریخی وعلمی واقعات کا تذکرہ بھی نہایت وثوق سے۔

حضرت الاستاذ کو اردو اور فارسی ادب سے خاصا لگاؤ رہا، جو اُن کی تصنیفات اور ان کے مضامین میں ظاہر ہوتا ہے۔ انداز تحریر انفرادیت لئے ہوئے، اسلوب جداگانہ، اردو اور فارسی کے الفاظ، جملوں اور اشعار کا برمحل استعمال ہر تحریر میں۔

''تندرستی ہزار نعمت ہے'' غالب نے کہا تھا اور حضرت شاہ صاحب نے اسے عملی شکل میں اختیار کر رکھا تھا، کھانے پینے میں احتیاط، پڑھنے اور سونے کا ایک معمول، اور روزانہ صبح وشام ایک دو کیلومیٹر کی تفریح (چہل قدمی) اتنی پابندی سے کہ کہیں کسی حال میں ناغہ نہ ہو، ضرورت پڑنے پر ریل کے ڈبے میں یا ہوائی جہاز پر بھی اس ضرورت کی تکمیل کر لیتے (ہم جیسے کسل مندوں کے لیے عبرت لیکن اس

حد تک پابندی کر لینا ہمارے نزدیک ایک مرض) حضرت مولانا نے تقریباً اسّی سال سے زائد عمر پائی، لیکن ان کی صحت قابل رشک رہی، اخیر کے چند ماہ علالت میں گذرے اور پھر ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو وفات پائی۔

ان کی تصنیفات میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: طریقۂ تعلیم ترجمہ تعلیم المتعلم، تذکرۃ الاعزاز، فروغِ سحر، گل افشانئ گفتار، خطباتِ کشمیری، نقش دوام (سوانح علامہ کشمیری) لالہ وگل، تفسیر ابن کثیر کا حاشیہ اور تفسیر بیضاوی کے ایک حصہ کی شرح۔

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری نے برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش کے ہزاروں اجتماعات میں شرکت کی اور اپنی خطابت کے جلوے بکھیرے، برصغیر کے باہر ملکوں ملکوں لوگوں کو اپنے بیانات سے مسحور کیا، دینی ودعوتی پروگرام کے تحت جنوبی افریقہ، پناما، کناڈا، ویسٹ انڈیز، برطانیہ، ماریشس، ری یونین، زامبیا کے علاوہ عرب ممالک سعودی عرب، کویت، دبئ، شارجہ وغیرہ میں ان کے قدم پہنچے، وہاں بھی ان کی تقریر اور درس قرآن کے ہزاروں متوالوں نے فیض حاصل کیا۔

یہ سب اسفار ان حالات میں ہوئے ہیں کہ ان کی طبیعت عام طور پر سفر پر آمادہ نہیں ہوتی اور بسا اوقات معمولی عذر یا بیماری انھیں اسٹیشن اور ہوائی اڈوں سے واپس لانے کا سبب بن جاتی تھی، اجتماعات کے منتظمین ان کی صحت اور اجلاس میں شرکت کے لیے بلا مبالغہ سب سے زیادہ دعائیں کرتے تھے۔

ان کے خطابات کی سحر آفرینی کا اعتراف ہر اپنے بیگانے کو ہے، ان کے درس کے شائقین ہزاروں ہیں، ان کی تصنیفی خدمات کا اعتراف اہل علم کو بھی ہے اور حکومت ہند کو بھی، اسی لیے ان کی عربی، فارسی خدمات پر حکومت نے انھیں صدر جمہوریہ اعزاز سے بھی نوازا، صدر مملکت جناب اے پی جے عبدالکلام کے ہاتھوں توصیفی سند اور ایوارڈ حاصل کر چکے۔

اخیر عمر میں وہ رمضان المبارک کی تعطیلات میں سفر سے گریز کرتے ہوئے جامعۃ الامام محمد انور شاہ کی مسجد میں درس قرآن اور بیان کا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے، بعد نماز عصر بیان ہوتا رہا اور تراویح کے بعد درس قرآن۔

ان کی اولاد میں ایک لڑکا اور کئی لڑکیاں ہیں جو سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ ان کے فرزند مولانا احمد خضر شاہ کشمیری اپنے والد کے علمی جانشین، تدریس، تقریر، تحریر اور انتظام میں بھی، بیحد ذہین اور اچھے منتظم، ''جامعۃ الامام محمد انور شاہ'' کے مہتمم، ماہنامہ محدث عصر کے مدیر اعلیٰ اور دار العلوم دیوبند وقف کے استاذ و ناظم تعلیمات، اور باندازِ کشمیری مقبول و مشہور اور اب دو سالوں سے شیخ الحدیث بھی۔

خطیب الاسلام
حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ

دارالعلوم دیوبند کی تحریک کے بانی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے خاندان میں دینی وعلمی وراثت کے جانشین ہمیشہ سے موجود رہے ہیں، ہر نسل میں عالم، فاضل، حافظ اور قاری ملیں گے، اس طرح ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصہ ہوگیا، سلسلہ جاری ہے، حضرت نانوتوی کے پوتے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تو مسلک دیوبند کے ترجمان اور اکابر دیوبند کے علمی امین ہونے کے علاوہ شارح علوم نانوتوی بھی رہے اور بحیثیت مہتمم دارالعلوم، ادارے کی ترقی، تعلیمی وتعمیری وسعت اور پوری دنیا سے متعارف کرانے کے روحِ رواں اور دارالعلوم دیوبند کی زندگی کے نصف عمر تک اس کے مخلص باتوفیق خدمت گذار بھی۔

ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی (صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) دارالعلوم کے وہ استاذ جو تدریس کے ساتھ وقت کے اتنے پابند کہ بلاشبہ درسگاہ میں ان کی آمد پر طلبہ اپنی گھڑیوں کے ٹائم سیٹ کرتے، جب میں ابتدائی سالوں میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، ان سے متعلق کوئی کتاب نہیں تھی، جلالین شریف اور شرح عقائد نسفی کا ان کا درس معروف تھا، مگر ہم طلبہ دیکھا کرتے کہ وہ متعینہ درسگاہ (دارالتفسیر) میں ایک قدم اندر رکھتے اسی وقت گھنٹہ بجتا تھا،

وقت کے منٹوں اور سیکنڈوں کے لحاظ سے اتنے پابند دار العلوم کے اساتذہ وکارکنان میں کوئی نہیں تھا، موقوف علیہ کی جماعت میں احقر کی شرح عقائد ان سے متعلق تھی جو اُن کو سالہا سال کی تدریس کے نتیجے میں بالکل ازبر تھی، اسی لیے دوران درس روانی یا سلاست میں کبھی فرق نہیں آیا، خطابت چوں کہ ان کو ورثہ میں ملی تھی اس لیے تدریس میں بھی یہی رنگ غالب تھا، طلبہ کی توجہ ذرا بھی ہٹی تو مضمون کا بیشتر حصہ نکل چکا ہوتا، ہماری طالب علمی کے زمانے میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ حضرت الاستاذ نے امتحان میں کبھی کسی کو ناکام نہیں کیا ہے، اس وقت ان سے ملنے یا مزید استفادے کا موقع ہی نہیں تھا، یہ بھی ان کی خوبی تھی کہ تدریس کے لیے وہ اپنے گھر سے نکلتے اور براہ راست درسگاہ میں پہنچتے، اختتامی گھنٹہ بجتا اور وہ واپس صدر گیٹ کے راستے سے اپنے گھر کو، نہ کسی سے ملاقات، نہ کسی دفتر میں جانا اور نہ ہی ادھر ادھر دیکھنا۔ راقم الحروف نے طالب علمی اور ملازمت کے دوران ۱۹۸۲ء تک ان کو کبھی کسی دفتر یا کسی استاذ کے پاس بیٹھے نہیں دیکھا۔

دار العلوم دیوبند کسی عام مدرسے یا تعلیم گاہ کا نام نہیں ہے، ابتدا ہی سے مسلمانان ہند میں اس کو جو مرجعیت حاصل ہوئی اور اب تک ہے وہ کسی اور علمی تحریک یا کسی اور دار العلوم کو حاصل نہیں، یہ ایک تحریک تھی جو بیحد پر آشوب دور میں شروع ہوئی اور اخلاص وللّٰہیت کا اعلیٰ نمونہ، جو ''دار العلوم دیوبند'' کے نام سے معروف ہوئی، اور دار العلوم دیوبند کے اغراض و مقاصد صرف درس وتدریس تک محدود نہ تھے، بہ یک وقت اساتذۂ علوم دینیہ، ماہرین قرآن وحدیث، کاملین علوم معقولات کا مرکز تھا، اور مجاہدین آزاد پر مشتمل افراد کا منبع بھی تھا، پورے ہندوستان میں اسلامی علوم وشریعت کے تحفظ اور اس کی نشر واشاعت کا سرچشمہ بھی اور رشد و ہدایت، دعوت وتبلیغ، تحریر وصحافت کے طالبین وحاملین کے لیے قیمتی

سرمایہ بھی، اس لیے اس ادارے کے کسی بھی شعبے سے وابستگی کو ملک و بیرون ملک عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، اور کسی بھی شرعی، اسلامی اور ملّی مسئلے میں دارالعلوم دیوبند کی جانب مسلمانانِ ہند کی نظریں پڑتی ہیں، ملک میں جب مسلمانوں کو کوئی پریشانی اور الجھن درپیش ہوتی تو دارالعلوم کی رہنمائی یا رائے کا لوگوں کو انتظار رہتا ہے۔

اتنی اہمیت اور حیثیت کی حامل اس درسگاہ کا اہتمام و انتظام بھی اسی شان وشوکت کا عکس ہوا کرتا تھا، چنانچہ ۶۰ ؍سال سے زائد کے عرصے تک اس مرکزی ادارے کے مہتمم رہنے والے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ کا عہد اہتمام اسی امتیاز وخصوصیت کا حامل تھا، دارالعلوم کو ایک سلطنت یا ریاست کا رتبہ اور مقام حاصل تھا، اسی لیے حضرت قاری صاحبؒ دیوبندی طائفہ کے نہ صرف سربراہ تھے بلکہ مسلک دیوبند کے ترجمان بھی، ان کا اہتمام بھی اسی عظمت ورفعت کا حامل سمجھا جاتا رہا۔ ایسے میں ان کے صاحبزادگان کو روایتی انداز کا احترام بھی حاصل تھا، اگر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کسی شعبے کی نظامت یا سربراہی کی خواہش رکھتے یا انتظام میں مداخلت کرنا چاہتے تو اس عرصے میں نہ کسی کو (بشمول مجلس شوریٰ) اعتراض ہوتا، نہ کوئی مخالفت کرنے کی ہمت کرتا، مگر دارالعلوم کی تاریخ شاہد ہے، طلبہ اور اساتذہ گواہ ہیں کہ انھوں نے کبھی بھی انتظامی امور میں مداخلت نہیں کی، بلکہ دارالعلوم کے داخلی امور سے سوائے تدریس کے کوئی دلچسپی بھی نہیں لی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد سالم کے معاصرین یا شدید مخالفین کی جانب سے بھی ۱۹۸۰ء تک ان پر کبھی اس طرح کا الزام بھی عائد نہیں ہوا۔ اجلاس صد سالہ منعقدہ مارچ ۱۹۸۰ء سے پہلے بھی بعض اراکین شوریٰ نے حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ مولانا سالم صاحب کو نائب مہتمم بنانے کی تجویز

شوریٰ میں پیش کردی جائے جو بلاشبہ منظور ہوجائے گی مگر حضرت مہتمم صاحب نے اس رائے کی قطعی حوصلہ افزائی نہیں کی اور مولانا سالم صاحب نے بھی اس منصب کو لائق اعتناء نہیں سمجھا۔

مگر اجلاس صد سالہ کے بعد جب دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں اور عملی شکل میں اس کی منصوبہ بندیاں آگے بڑھیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کی رائے یا مشورے سے یا بیرونی سازش، مولانا محمد سالم قاسمی کو نائب مہتمم اور مولانا انظر شاہ کشمیری کو صدر المدرّسین مقرر کردیا گیا، بس کیا تھا مخالفین کے ہاتھوں تیز دھار کا ہتھیار آگیا، پھر اس طرح کے الزامات اور پروپیگنڈے شروع ہوئے جن کا تصور حاملین جبہ ودستار سے متصور ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد سالم صاحب ۸/جنوری ۱۹۲۶ء میں خاندان قاسمی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وتربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی، اپنی مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند ہی سے حاصل کی، ۱۳۶۷ھ میں فراغت ہوئی اور دارالعلوم کی تدریس سے وابستہ ہوگئے، خطابت موروثی تھی، حلقہ معتقدین کا، اس لیے ملک و بیرون ملک دعوتی اسفار ہوتے رہے، بلکہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دیوبند میں قیام اور تدریس واہتمام کے ایام کے مقابلے میں اسفار اور اجلاس، کانفرنس، سیمینار وغیرہ میں شرکت کے لیے دورے زیادہ ہیں۔

۱۹۸۲ء میں دارالعلوم وقف دیوبند کا آغاز ہوا، جولائی ۱۹۸۳ء میں حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ کا وصال ہوا، اسی دن سے دارالعلوم وقف کے متولّی ومہتمم رہے۔

خاندان قاسمی کی بہت سی خوبیوں اور خصوصیات کے وارث وامین، ہر جماعت اور ہر طبقے کے لیے محترم، باوجودیکہ ان کے خلاف باضابطہ مہم بھی چلائی گئی، ان کو

مطعون کرنے کی کوشش ہوئی، مگر انھوں نے کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہی، مثبت انداز میں وقف دارالعلوم کا تعارف کرایا، اپنی نجی مجلسوں میں بھی وہ کسی کے خلاف بولنے کے روادار نہیں، نہ غیبت کرنا جانتے، نہ سننا پسند کرتے، سخت ترین مخالفین کے خلاف بھی لب کشائی نہیں فرماتے، مجلس میں ہوں تو باوقار، اسٹیج پر ہوں تو نمونۂ اسلاف، مگر سفر میں ہوں تو مرنجا مرنج، خوش مزاج، مدارس کے اجلاس میں شرکت کرتے مگر سفر کے تعب ومشقت کا قطعی تذکرہ نہیں، ہر طرح کے سفر اور بے آرامی کے خوگر، خورد ونوش، قیام وطعام میں نہ کوئی پرہیز نہ کسی چیز کی خواہش اور تقاضہ۔

ان سب اسفار اور مشغولیتوں کے باوجود مضمون نویسی اور تالیف کے لیے وقت نکالتے تھے مختلف عنوانات پر بیش قیمت مقالے تحریر کئے، کتابوں کے لیے تمہیدی مقدمات اور تقریظات بے شمار لکھے، چند کتابیں بھی طبع ہو چکی ہیں، اور بہت سارا مواد طباعت کا منتظر، مطبوعہ کتب میں: مبادی التربیۃ الاسلامیۃ (عربی)، تاجدار ارضِ حرم کا پیغام، مردانِ غازی اور ایک عظیم تاریخی خدمت قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا کو عربی زبان پر بھی قدرت تھی اس لیے کچھ دینی اور تحقیقی مضامین عربی میں بھی تحریر کئے۔

بالآخر ترجمانِ مسلک دیوبند، جانشین حکیم الاسلام، نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴/اپریل ۲۰۱۸ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

حضرت مولانا اسلام الحق اعظمیؒ

حضرت مولانا اسلام الحق اعظمی اکابر دیوبند کی سادگی کے پیکر تھے، نہایت سادہ مزاج، اور خاموش طبع، علوم عربیہ کے باصلاحیت استاذ اور شارح۔ دورۂ حدیث میں ان سے ابن ماجہ کا درس لیا۔

مولانا اسلام الحق ۱۹۰۳ء میں کوپا گنج (اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی، پھر کانپور مدرسہ احیاء العلوم گئے جہاں قطب زمانہ، مصلح و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قیام پذیر تھے، ان سے بعض کتابوں کا ابتدائی درس تبرکاً حاصل کیا۔ پھر موقوف علیہ کی جماعت میں مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ (بہار) میں داخل ہوئے، جہاں جامع العلوم و امام المعقولات حضرت علامہ بلیاوی مدرّس تھے، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچے، وہاں دورۂ حدیث کے علاوہ مزید فنون کی کتابیں پڑھیں، ان کے اساتذہ میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین صاحب، شیخ الادب مولانا اعزاز علی اور علامہ بلیاوی جیسے نابغۂ روزگار علماء و شیوخ ہیں۔

فراغت کے بعد اپنے وطن پہنچے اور وہاں کے معروف مدارس دینیہ میں درس وتدریس کی ذمہ داریاں انجام دی۔ دارالعلوم مئو میں صدر المدرّسین بھی رہے، وہاں سے علیحدگی کے بعد بایماء محدّثِ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی ڈابھیل میں تدریس کے لیے گئے اور پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

میں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز ہوئے۔

بالآخر اکابر دیوبند خاص طور پر مجلس شوریٰ کے اراکین اور استاذ محترم حضرت علامہ بلیاوی کی مساعی سے دار العلوم دیوبند میں درجہ علیا کے مدرّس کی حیثیت سے ۱۹۶۰ء میں تقرر ہوا، ابتدا میں شرح عقائد نسفی، ملاحسن وغیرہ کتابیں درس میں رہیں، پھر دورۂ حدیث کے اسباق متعلق ہوئے۔ اب اس مرکز علوم میں آنے کے بعد حضرت مولانا کی مشغولیت تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف بھی ہوگئی۔

ان کا درس مختصر اور جامع ہوتا تھا، طویل تقریر کے بجائے تشریح عبارت اور تفہیم پر زور دیتے، اس لیے طلبہ کے لیے ان کے اسباق سے استفادہ بہت آسان ہوجاتا۔

ان کی خارجی مصروفیات نہیں تھیں، جلسوں اور مجلسوں میں شرکت کا مزاج نہیں تھا، اپنے حجرے میں کتابوں کا مطالعہ ہی ان کے لیے سب سے بڑی مصروفیت ہوتی، اس وجہ سے انھوں نے اپنی علمی صلاحیتوں کو تصنیف وتشریح کے لیے نئی جہت دے دی، مشکل کتابوں کی شروحات اور حواشی میں مشغول ہوئے، چنانچہ ان کی تصنیفی خدمات میں قطبی کی شرح، میبذی کی شرح اور فیض الملہم شرح مقدمہ مسلم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منطق اور فلسفہ کی کتابیں طلبہ کے لیے دشوار ہوا کرتی ہیں اس لیے ان کی اردو شروحات کی بیحد ضرورت تھی، حضرت مولانا نے ہی سب سے پہلے منطق وفلسفہ کی کتابوں کی تسہیل اور تشریح کی اور طلبہ اس کے لیے ہمیشہ ان کے ممنون رہے۔

نصف صدی سے زائد تدریسی وتصنیفی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۲ء میں طویل علالت کے بعد اپنے وطن کوپاگنج میں وفات پائی اور اپنے آبائی مقبرے میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ

دیوبند کے قدیم باشندے، ان کے اسلاف نیک اور دیندار، کسی حد تک بدعات کی جانب مائل، مگر عشق رسول کے متوالے، بعض افراد خانہ کچھ مزارات وخانقاہوں کے متولّی بھی، مگر حضرت مولانا محمد نعیم صاحب نے چوں کہ اپنی دینی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں مکمل کی اس لیے ان پر خاندانی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ ان کے علم وعمل نے ان کی ذاتی وجاہت میں بھی اضافہ کیا، خود خاموش طبع، یکسو مزاج، سادگی پسند، ہجوم اور اجتماعات سے الگ تھلگ رہنے والے، قہقہہ تو دور کی چیز لوگوں نے ہنستے ہوئے بھی کم ہی دیکھا ہوگا، اور ہم طلبہ میں تو عام طور پر یہ مقولہ زباں زد کہ اگر حضرت مولانا محمد نعیم صاحب ہنس پڑیں تو بارش لازمی، متانت کے مجسم پیکر، دارالعلوم کے احاطے میں داخل ہوں تو نظریں نیچی، سر اٹھایا اور دیکھ لیا تو بڑی سعادت، پیچھے مڑکر دیکھنا ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ بغل میں کتاب اور براہ راست درسگاہ میں داخل ہوکر تدریس میں مشغول ہونا ان کی پہچان، سبق ختم ہوا تو اکیلے واپس جانا ان کا وصف خاص، کسی زمانے میں بھی انھوں نے خادم یا طلبہ کی معیت گوارہ نہیں کی، بزرگوں یا نمایاں نظر آنے والے والوں کے روایتی تام جھام کے عملی مخالف، اور تدریس میں ایک خاص طرز، کتاب کی تشریح اور تسہیل اصل مقصود، لمبی چوڑ تقریر کے خوگر نہیں، اس لیے ان کا یہ انفرادی ریکارڈ ہوگا کہ

ہر متعلقہ کتاب کو اپنے وقت پر نصاب تک پہنچا دیتے۔

جس وقت میں متوسطات کے درجے میں دارالعلوم میں زیر تعلیم رہا ان سے متعلق کوئی کتاب نہیں تھی، وہ نہائی درجات کے استاذ تھے، البتہ وہ اس وقت ناظم دارالاقامہ ہوا کرتے تھے اور طلبہ کی نگرانی ان سے متعلق تھی، دورۂ حدیث کے سال میں ''موطا امام محمدؒ'' کا درس ان سے متعلق ہوا اور جمعہ کے دن سبق ہوتا، اس لیے ان سے استفادے کا بہت کم موقع میسر آیا، نہ ان سے جان پہچان، نہ قربت، طلبہ سے خدمت لینا ان کی فطرت کے خلاف، فراغت کے بعد بھی چند سال احاطۂ دارالعلوم میں گذارے مگر ان سے دور رہے، مشہور تھا کہ وہ بیحد خشک طبیعت کے ہیں۔ دارالعلوم میں ملازمت کے دوران ۱۹۸۰ء تک بھی ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ اجلاس صد سالہ کی سرگرمیوں اور ہنگاموں کے بعد انھوں نے پہچانا۔

۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند پر ایک گروپ کے قبضے کے بعد مولانا دہلی تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ رحیمیہ مہندیان میں شیخ الحدیث کے بطور بخاری شریف کا درس دیتے رہے، مختصر عرصے کے بعد ہی ان کو دارالعلوم وقف دیوبند میں بحیثیت شیخ الحدیث متعین کیا گیا۔

دیوبند میں تدریس کے ساتھ ہی تعلیمات کے امور کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کی گئی، اس سے قبل حضرت مولانا خورشید عالم صاحب نائب مہتمم دارالعلوم وقف ہی تعلیمی امور کی نگرانی کر رہے تھے، اب شیخ الحدیث ہی ناظم مجلس تعلیمی قرار پائے، وقف دارالعلوم کی ابتدا ہی سے راقم الحروف ناظم مجلس تعلیمی کے معاون کے طور پر کام کرتا رہا تھا، اس لیے میری خدمات بھی مولانا نعیم صاحب کی جانب منتقل ہو گئیں، یہیں سے میرا ان سے زیادہ قرب ہوا، سالہا سال تک ان کے نائب کی حیثیت سے مفوضہ خدمات کی انجام دہی کا موقع ملا ہے، دفتر تعلیمات میں بھی اور

ضرورت کی حد تک ان کے مکان پر بھی، خاص طور پر امتحانات کے موقع پر، سوالات کی ترتیب، کتابت اور طباعت وغیرہ کے امور میں حضرت نے جس طرح اعتماد فرمایا اور میری خدمت کو سراہا وہ میرے لیے ایک سند اور سعادت ہے۔

اس دوران ہی ان کی صلاحیتیں اور خوبیاں ہم پر آشکارا ہوئیں، کہاں تو طلبہ میں سخت گیر اور خشک مشہور تھے، اور کہاں اپنے ایک شاگرد پر بے پناہ اعتماد اور نوازشیں، نرم گفتگو، حوصلہ افزا کلمات اور پر لطف واقعات اور علمی نکات کی بارش، خوردوں کے مشورے بھی لائق اعتنا اور توجہ طلب، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ عالمانہ وقار، ظاہر وباطن یکساں خوبیوں کے مالک، مطالعہ اور لکھنے پڑھنے سے بیحد شغف، اصول و ضوابط کے ساتھ اکابر و اسلاف کے طور وطریق پر عمل، یہ سب تمام باتیں ان سے قریب ہونے پر نظر آئیں اور میں ان سے نہ صرف متأثر ہوا بلکہ معتقد بھی۔

دارالعلوم وقف دیوبند میں بخاری شریف کا بیشتر حصہ ان کے زیر درس ہوتا اور اپنی تدریسی خصوصیات کے ساتھ متعینہ وقت پر اس کی تکمیل بلاشبہ ان کی انفرادیت، دارالحدیث میں درس دیتے ہوئے مکمل مشغول، اپنے متعینہ گھنٹوں کے علاوہ اگر مزید گھنٹے خالی ہوں تو ان میں بھی درس جاری رہتا، دو تین گھنٹوں تک مسلسل درس دیتے رہنا ان کی عادت تھی۔

ان کے اکلوتے صاحبزادے مولانا قاری عبداللہ سلیم (سابق مدرّس دارالعلوم دیوبند) انقلاب دارالعلوم کے بعد امریکہ کے شہر شکاگو چلے گئے اور وہاں اسلامی مرکز قائم کر کے دارالعلوم کی خدماتِ درس وتدریس و دینی رہنمائی کے سلسلے کو آگے بڑھایا، وہاں شہریت حاصل ہوئی تو حضرت مولانا محمد نعیم صاحب کا قیام بھی امریکہ رہنے لگا، ایام درس میں دیوبند تشریف لاتے پھر بخاری شریف کی تکمیل کے بعد امریکہ ہی چلے جاتے، آنے جانے کا سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا، اخیر عمر میں نگاہ

کمزور ہوگئی مگر قویٰ مضمحل نہیں ہوئے، بالآخر امریکہ ہی میں ۲۰۰۷ء میں ان کی وفات ہوگئی۔ اس دوران ان کے چاروں پوتے عبدالرحمٰن، عبیداللہ، سعد اور سلمان دارالعلوم وقف دیوبند سے تعلیم سے فارغ ہوئے اور امریکہ ہی میں سکونت پذیر ہوئے جہاں اپنے والد اور گرامی قدر دادا (حضرت شیخ الحدیث) کے مشن کو آگے بڑھائے ہوئے ہیں، دیوبند کا فیضان علم امریکہ میں بھی جاری ہے۔ بحمد اللہ یہ چاروں نوجوان فضلاء راقم الحدیث کے شاگرد بھی ہیں، دورۂ حدیث کی کتابیں احقر سے پڑھی ہیں، خصوصی طور پر عزیزم مولوی عبیداللہ قاسمی نے عربی زبان وادب کی کچھ کتابیں پڑھیں اور ترجمہ وانشاء کی مشق کی ہے۔

حضرت مولانا عبدالاحد دیوبندیؒ

دیوبند کے ایک دیندار اور علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، پابند شرع، متقی اور صالح عالم دین، ان کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث تھے، اس لحاظ سے ان کی تعلیم وتربیت قطعی دینی ماحول میں ہوئی، ابتدائی دینیات سے انتہائی تعلیم تک دارالعلوم دیوبند کے علمی وروحانی ماحول میں ہوئی۔ حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد عربی درجات کی تعلیم بھی یہیں مکمل کی۔

اس کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرّس عربی تقرر ہوا اور درجۂ علیا تک پہنچے، حدیث میں مشکوٰۃ شریف کے علاوہ نسائی، ابوداؤد اور مسلم شریف کا درس دیا، ۱۹۷۱ء میں ہمیں ان سے ابوداؤد شریف مکمل پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، وقت پر پابندی کے ساتھ درس میں حاضری ان کا معمول تھا، سبق میں تفہیم کی کوشش کرتے اور حسب ضرورت طویل بحث بھی کرتے، بسا اوقات ایک ہی مسئلے کو بار بار دہراتے تاکہ طلبہ کے ذہن نشین ہوجائے، ان کا تکیہ کلام ''آں پر بھائی'' تھا جو غالباً ''یہاں پر بھائی'' کا مخفف تھا، طلبہ حضرت مولانا کا نام لینے کی بجائے کہتے کہ ''آں پر بھائی'' آگئے ہیں۔

میں نے ہمیشہ ان کے سبق میں حاضری کی پابندی کی ہے جب کہ پہلا گھنٹہ بعض طلبہ کا چائے یا ناشتہ کی وجہ سے چھوٹ بھی جاتا تھا۔

اپنے سبق میں عام طور پر کسی مسئلے کی بحث کے وقت فرمایا کرتے تھے کہ آں

پر بھائی یہاں تین باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھیں، اور بیان کرتے وقت وہ بات کبھی چار اور کبھی پانچ کی تعداد کو متجاوز ہو جاتی۔ اور دورانِ درس اپنے شیخ اور استاذ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتے اور ان کی باتیں سنایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا دیوبند کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب بھی تھے، اور چوں کہ جید حافظ تھے اس لیے رمضان المبارک کی تراویح خود پڑھایا کرتے تھے، راقم الحروف نے ایک سال حضرت کی اقتداء میں تراویح مکمل کی ہے۔

مولانا کی ایک تصنیف ''کنز الفرائد'' ہے جو شرح عقائد کی شرح ہے۔

حضرت مولانا کے تین لڑکے ہیں، جو بحمد اللہ عالم دین اور حافظ قرآن ہیں، اور وہ سب تدریسی و اصلاحی خدمات میں مشغول ہیں، بڑے صاحبزادے مولانا بلال اصغر دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہیں، چھوٹے صاحبزادے مولانا غانم صاحب مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور مدرّس ہیں۔

مولانا کا انتقال اجلاس صد سالہ سے قبل ۱۹۷۹ء میں ہوا، قبرستان قاسمی میں مدفون ہیں۔

حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ

تقسیم ہند کے بعد دارالعلوم دیوبند کے چند نامور اساتذہ پاکستان ہجرت کر گئے جو فیض ربانی اور دینی وملّی خدمات کے لحاظ سے دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں کو بیرون ملک وسیع کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔ مگر جو اساتذہ موجود رہے یا اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے بلائے گئے ان کی تعداد بے شمار ہے، ان میں بہت سے حضرات شیخ الحدیث کے درجے کے تھے، بہت سے جامع العلوم اور ماہر فنون، بعض محدث یگانہ تو بعض مفسر بے نظیر، اور کچھ ایسے جو تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول، ان کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اہم ذمہ داریوں کے حامل، ان کے حالات وخدمات کا تذکرہ رسائل میں یا بعض سوانحی خاکوں میں مل جاتا ہے، مگر بعض ایسی عبقری شخصیات بھی رہیں جن کی سوانح اور خدمات پر مشتمل تحریریں نہیں ملتیں۔

خاص طور پر میں نے چالیس سال کے عرصے میں جن یکتائے روزگار علماء ومدرّسین کو دیکھا یا ان سے کسب علم کیا ان میں سے دو شخصیتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کم لکھا گیا اور ان کی یادیں صرف ان کے شاگردوں کے سینے میں ہی محفوظ ہیں، یا ان کے تلامذہ ان کا حوالہ دیتے ہیں، اور دارالعلوم دیوبند کے فرزندان کی نئی نسل ان کی حیثیت، خدمت اور ان کے عملی کارناموں سے واقف بھی نہیں۔

ان میں سے ایک حضرت مولانا شریف الحسن دیوبندی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے باضابطہ شیخ الحدیث بھی رہے ہیں۔

دوسرے حضرت مولانا محمد حسین بہاری علیہ الرحمہ ہیں جن کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، حضرت کو ''مولانا بہاری''، ''ملا بہاری'' اور ''علامہ بہاری'' کے لقب سے طلبہ یاد کرتے ہیں، مولانا صوبہ بہار کے ضلع مظفر پور (اب شیوہر) کے ایک گاؤں کے رہنے والے غریب طالب علم تھے، جنھوں نے اپنی جدوجہد سے بے حد پریشانیوں کے باوجود دینی تعلیم دارالعلوم دیوبند سے مکمل کی اور اس امتیاز کے ساتھ کہ نامور مدارس ان کو اپنے ادارے میں متعین کر کے فخر محسوس کرتے، انھوں نے ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی پھر دارالعلوم شاہ بہلول سہارن پور، مدرسہ اشرفیہ راندیر گجرات اور مدرسہ صدیقیہ دہلی میں مختصر عرصے کے لیے تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر خود اربابِ دارالعلوم دیوبند نے ان کی علمی لیاقت ومہارت کی بنیاد پر ۱۹۴۸ء میں تدریسی خدمات کے لیے دارالعلوم میں تقرر کیا، جلد ہی درجۂ وسطیٰ سے درجۂ علیا تک پہنچ گئے اور اعلیٰ درجات کی کتابیں ان سے متعلق ہوگئیں۔

۱۹۷۰ء میں جب میں موقوف علیہ (سال ہفتم) میں داخل تھا تو ہدایہ اخیرین کا سبق دو حصوں میں تھا، دو جماعت ہوتی تھی، ایک جماعت حضرت میاں اختر حسین صاحب سے متعلق اور دوسری جماعت کی ہدایہ اخیرین حضرت مولانا معراج الحق صاحب نائب مہتمم کے پاس، مگر اس سال طلبہ کی تعداد زیادہ ہوگئی تو اس درجہ کی ہدایہ اخیرین کے لیے تیسری جماعت تیار کرنی پڑی، نظامت تعلیمات نے ہدایہ اخیرین حضرت علامہ محمد حسین بہاری سے متعلق کردی، میں بھی اسی جماعت میں تھا، تقریباً ۹۰؍طلبہ تھے، مولوی عبدالرب اعظمی اور مولوی محمد عثمان میواتی احباب

میں سے تھے، اس وقت طلبہ میں عام تأثر یہ تھا کہ علامہ بلیاویؒ کے بعد امام المعقولات حضرت مولانا بہاری ہیں، اس بنیاد پر خیال ہوا کہ فقہ کی اتنی اہم کتاب ہدایہ اخیرین حضرت مولانا کس انداز سے پڑھائیں گے، اس کے لیے دو گھنٹے مختص تھے، پہلا اور دوسرا گھنٹہ، حضرت مولانا دس منٹ کے بعد بڑی پابندی سے تشریف لاتے، ہدایت سخت تھی کہ ان کے آنے سے قبل تمام طلبہ درسگاہ میں موجود رہیں اور چونکہ وہ تعلیمی معاملات میں سخت گیر تھے اس لیے سب موجود رہتے، پھر سبق شروع ہوتا، آواز دھیمی، پہلے ترجمہ اور مطلب کی وضاحت پھر حسب ضرورت تشریح، یہی ان کا طرز تدریس ہر کتاب میں تھا، مگر جب سبق ختم ہوتا تو ہمیں محسوس ہوتا کہ نہ صرف مسئلہ سمجھ میں آ گیا ہے کہ بلکہ ذہن میں اس طرح جم گیا ہے کہ اب تکرار ومذاکرہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک مسئلہ کو بسا اوقات دوبار یا تین بار دہراتے۔

آج اتنے سالوں کے بعد بھی یہ کہتے ہوئے طالب علمانہ افتخار محسوس ہوتا ہے کہ اس سال اس کتاب سے بہتر اور کوئی کتاب از بر نہیں ہو سکی۔ تدریس میں تفہیم کا یہ انداز اور ہدایہ اخیرین کے فقہی مسئلے حضرت مولانا نے اس طرح حل کئے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فقہ کے بھی ماہر تھے۔

یادش بخیر! اس ضمن میں تحدیث نعمت کے طور پر ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے عربی درجات میں تین کتابیں سب سے زیادہ یاد رہیں، پوری طرح کتاب کو سمجھ کر از بر کر لینے کی حد تک، ایک شرح جامی جو امام النحو علامہ صدیق کشمیری سے مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھی تھی۔ دوسری کتاب مقامات حریری جو شیخ الادب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی سے متعلق تھی، اور تیسری کتاب یہی ہدایہ اخیرین۔ اور بلاشبہ یہ تینوں کتابیں نحو، ادب اور فقہ میں اہم ترین اور مشکل کتابیں ہیں اور ان تینوں کتابوں کو اس طرح از بر کر لینے کے بعد یاد رکھنے میں قدر مشترک

کے طور پر ان اساتذۂ کرام کے طرز تدریس اور تفہیم کا دخل تھا، بحمد اللہ تینوں کتابوں کی تدریس سالہا سال تک راقم الحروف نے انجام دی ہے اور بڑے ذوق وشوق سے، تینوں کتابوں کی بعض عبارتیں بھی زبانی یاد رہی ہیں، مقامات حریری کے بہت سے اشعار اور عبارتیں آج پچاس سال کے بعد بھی حافظے میں موجود ہیں۔

اس طرح ہدایہ اخیرین حضرت سے پڑھتا رہا اور درسگاہ میں اتنی قریب نشست رکھتا کہ اگر حضرت اپنے دست مبارک سے تھپڑ بھی مارنا چاہیں تو انھیں دشواری نہ ہو۔

راقم الحروف گو کہ قدیم طالب علم تھا مگر حضرت مولانا بہاری سے پہچان اسی سال ہوئی اور حضرت کی شفقت، محبت اور حوصلہ افزائی کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک برقرار رہا۔

امتحان ششماہی تقریری ہوا، حضرت مولانا نمبر کم دینے یا ناکام کرنے میں مشہور تھے، مگر اس کتاب میں تقریباً سبھی طلبہ کامیاب ہوئے، ایک دن سبق میں فرمایا کہ ''چمار چودس'' (یہ ان کا تنبیہی تکیہ کلام تھا) تم لوگوں نے مکمل طور پر صحیح جواب نہیں دیئے اور حد تو یہ ہے کہ اسلام دملکوی (راقم الحروف) بھی ایک جواب میں الجھ گیا تھا۔ اللہ اللہ! ان کا یہ جملہ میرے لیے کتنی تعریف وتوصیف اور حوصلہ افزائی لیے ہوئے تھا جو آج تک کانوں میں اسی طرح گونج رہا ہے، یہ جملۂ تحسین نہیں تھا، یہ ایک ولیٔ کامل، مشفق اور مربی استاذ کی وہ دعا تھی جس کی بدولت آج میں کم علم وبے مایہ اس مقام تک پہنچ سکا ہوں جس کا کبھی تصور بھی نہیں تھا۔

اگلے سال دورۂ حدیث میں ان سے متعلق نسائی شریف کا درس تھا، حسب روایت میں پابندی سے ان کے قریب ہی بیٹھتا تھا کہ مبادا کوئی علمی نکتہ چھوٹ نہ جائے، چوں کہ آواز ہلکی تھی اس لیے بعض طلبہ کو اس طرح کی شکایت ہوجاتی تھی۔

دورۂ حدیث میں احساس ہوا کہ حضرت کو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر بھی اتنا ہی عبور ہے، مگر مشہور ہیں امام المنطق والفلسفہ کے نام سے۔

اس طرح حقیقت میں حضرت مولانا محمد حسین بہاری دار العلوم کے ان چند اساتذہ کی فہرست میں آتے ہیں جن کو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ کے ساتھ ساتھ معقولات کی تمام کتابوں میں قدرت کاملہ اور مہارت حاصل رہی ہے۔

کسی بھی کتاب کے درس سے پہلے اس کا مطالعہ اور شروحات سے نوٹ کتاب کے حاشیے میں لکھنا ان کا معمول تھا، جو کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتیں ان پر حاشیہ درحقیقت ایک تحقیقی کام ہوتا جو بہت سے مراجع کا خلاصہ ہوتا، اگر وہ طبع ہوجاتیں تو بڑا کام ہوتا، اس کے علاوہ انھوں نے ابوداؤد شریف کے درس کے دوران باضابطہ اس کی عربی مختصر شرح بھی تحریر فرمائی، جس کا ایک حصہ میں نے خود دیکھا تھا مگر افسوس کہ ان کے صاحبزادوں نے اس کی طباعت کا اہتمام نہیں کیا، جب کہ ان کے تین لڑکے خود فاضل دار العلوم ہیں، مسودہ انہی کے پاس تھا۔

حضرت مولانا بہاری صاحب سے میری فراغت کے بھی رابطہ رہا، ان سے علمی استفادہ بھی کیا، ان کی مجلسوں میں شریک رہا، ان کی عنایتیں اور شفقتیں برابر جاری رہیں، بلکہ ان کے بعض قریبی احباب کا خیال تھا کہ مجھ پر بہت مہربان ہیں، جس کی علامت یہ ہے کہ وہ چائے بھی پیش فرماتے اور اس کے ساتھ دیوبند کا مشہور ''پاپا'' بھی عنایت کرتے جو ایک عجوبہ ہی ہوتا، ورنہ وہ قریبی شاگردوں سے دعوت اور چائے کا مطالبہ فرمایا کرتے تھے۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک ان کے یہاں حاضری دے کر ان کی دعائیں حاصل کرتا رہا، مجلس میں کبھی مفتی ظفیر الدین اور کبھی مولانا بدر الحسن قاسمی (ایڈیٹر الداعی) ہوتے اور بعض طلبہ، دار العلوم کے قضیہ نامرضیہ کے بعد ان کے در دولت

پر حاضری کی سعادت سے محروم ہوا تو حضرت نے غریب خانے پر کئی بار قدم رنجہ فرما کر روحانی دولت سے مالا مال فرمایا۔

۱۹۹۳ء میں کمزوری بھی غالب تھی کہ ایک حادثے میں کولھے کی ہڈی متأثر ہوگئی، داخل اسپتال ہوئے، مظفرنگر کے اچھے ڈاکٹر کے یہاں علاج ہوا، وہاں بھی حاضری دے کر حضرت کی صحت یابی کی تمنائیں کیں، دعائیں لیے رخصت ہوا، لیکن حضرت کو اس مرض سے افاقہ نہیں ہوسکا اور انتقال ہوگیا۔ قبرستان قاسمی دیوبند میں مدفون ہیں۔

شیخ الحدیث
حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

ولادت ۹/اگست ۱۹۲۰ء وفات ۲/جون ۱۹۷۷ء

دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث میں شیخ الحدیث، اس ادارے کی عظمت ورفعت کے نشان، اکابر دیوبند اور اسلاف امت کے نمونہ، حضرت مولانا شریف حسن دیوبندی، جن سے راقم الحروف نے ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ھ میں دورۂ حدیث کی جماعت میں مسلم شریف کا درس لیا، ان کے علمی فیوض سے مستفید ہوا۔

لمبا قد، گورا رنگ، خوبصورت چہرہ، سفید گھنی داڑھی، سفید لباس، روایتی جبہ ودستار سے بے نیاز، آنکھوں میں علمی لیاقت کی چمک، چہرے پر وجاہت ووقار کا رعب، رفتار میں متانت، سادہ مزاج، سہل گفتگو، کروفر کے شوق سے مبرّا، بیحد متواضع اور منکسر المزاج، یہ اوصاف تھے حضرت شیخ الحدیث مولانا شریف صاحب کے۔

دورۂ حدیث سے پہلے ان کا ہم طلبہ سے تعلق ناظم دارالاقامہ کی حیثیت سے رہا، ورنہ اس سے پہلے کسی کتاب میں ان سے درس کا موقع نہیں ملا، اور اس کے بعد حضرت کے حالات زندگی کی تفصیل بھی زیادہ فراہم نہیں ہوسکی۔

مگر جو ایک طالب علم نے دیکھا اور محسوس کیا تو وہ علم وعمل، تقویٰ و پرہیزگاری کے حامل، نیک نفس، سادگی کے پیکر ایسے عالم دین نظر آئے جن کو اللہ نے زبردست علمی صلاحیت سے نوازا تھا۔ مسلم شریف کے درس میں اتنے علمی نکات اور کسی استاذ کے یہاں نہیں تھے۔ حدیث کا ترجمہ اور تشریح کے بعد محدثین کے اقوال، فقہاء کے مسالک، ان کے دلائل اور پھر بعض نادر علمی فیوض، وہ چوں کہ خطیب نہیں تھے، اس لیے درس میں طویل تقریر نہیں ہوتی تھی، البتہ تمام مباحث کو مختصر اور کبھی غیر مربوط انداز میں اس طرح بیان فرما دیتے، لگتا یہ طلبہ کو نہیں بلکہ اساتذہ کو پڑھا رہے ہیں۔ اتنی گہرائی کہ اگر قدیم فضلاء شریک ہوں تو ان کو حدیث کی تشریحی کتاب مل جاتی۔

وہ خود چونکہ مطالعہ کے عادی تھے، اس لیے حدیث پر من کل الوجوہ بحث فرماتے، اس زمانے میں مشہور تھا کہ حدیث کے اسماء الرجال پر ان سے زیادہ کسی استاذِ حدیث کی گہری نظر نہیں ہے۔

انھوں نے مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہی حاصل کی تھی۔ دورۂ حدیث میں حضرت مدنی کے علاوہ حضرت علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کا درس لیا تھا، الگ سے انھوں نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی سے بھی بخاری کا کچھ حصہ پڑھا تھا، اس لیے ان سب حضرات کے علمی اثرات ان کے درس میں ملتے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طلب پر سب سے پہلے مدرسہ امداد العلوم خانقاہ تھانہ بھون تشریف لے گئے جہاں زائد از تین سال صدر مدرّس رہے، پھر مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں صدر مدرّس اور مفتی کی حیثیت سے طلبہ اور عوام کو مستفید فرمایا۔

لیکن حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے شروع ہوا

جہاں انھوں نے دس سال تک شیخ الحدیث کی حیثیت سے بخاری شریف اور دیگر حدیث کی کتابوں کا درس دیا، ان کی صلاحیت، علم حدیث میں مہارت اور تدریس کی شہرت دارالعلوم دیوبند تک لے آئی، جہاں وہ استاذ حدیث کی حیثیت سے بلائے گئے، اس کے ساتھ دیگر علوم وفنون کی کتابیں بھی ان سے متعلق ہوئیں جن کی تدریس میں مقبولیت تامہ حاصل رہی۔

اس لیے جب حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کا انتقال ۱۹۷۲ء میں ہوا تو اربابِ شوریٰ نے شیخ الحدیث کے منصب کے لیے مولانا کا نام تجویز کیا اور تاحیات اس عہدے پر فائز رہتے ہوئے بخاری شریف کا درس اسی شان سے دیا جو دارالعلوم دیوبند کا امتیاز ہے۔

مگر اس جلالت علمی اور اعلیٰ مقام کے باوجود حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی عادت یعنی سادگی اور ہر ایک سے مشفقانہ طور پر ملنا، پر برقرار رہے، حضرت خود ہی بازار سے گھر کا سودا سلف لاتے، کسی طالب علم کو مامور نہ کرتے، گرچہ طالب علموں اور ان کے شاگردوں کے لیے یہ خدمت سعادت ہوتی ہے۔ اپنی اس انکساری اور تواضع میں وہ اپنے معاصرین میں نمایاں حیثیت کے حامل رہے، ان کی وفات پر رسالہ دارالعلوم نے اداریے میں لکھا تھا:

> ''صورت شکل وجیہہ تھی، جہاں بیٹھتے تھے چھا جاتے تھے اور چہرہ بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ جید الاستعداد استاذ حدیث ہیں، ہنس مکھ اور ملنسار تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، ظاہر و باطن دونوں پاک تھے، کسی کی طرف سے کوئی بات دل میں نہ رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب صافی عطا فرمایا تھا، تواضع اور فروتنی پائی جاتی تھی، کبر وغرور کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، علوم حدیث سے ایک استاذ میں جو وصف پیدا ہوتے ہیں وہ سب آپ میں پائے جاتے تھے اور بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے، بے تکلفی اور سادگی کا یہ

عالم تھا کہ اپنے گھر کا سودا سلف خود لانے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں فرماتے تھے۔''

(ماہنامہ دارالعلوم جولائی ۱۹۷۷ء)

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا عامر عثمانی مدیر ماہنامہ تجلی نے بارہا اپنے رسالے میں مولانا کی علمی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے برملا تحریر کیا تھا کہ مجھے جب کسی علمی، دینی یا فقہی مسئلے میں الجھن ہوتی ہے تو مولانا سے رجوع کرتا ہوں اور وہ ان کا شافی حل بھی پیش کرتے ہیں، اور ''تجلی'' کے قارئین کو یاد ہوگا کہ اس میں دیوبند یا ملک کے نامور علماء تک پر تنقید عام بات تھی ایسے میں حضرت مولانا کے علمی کمالات کا اظہار دراصل ان کی قدرومنزلت، صلاحیت اور مقبولیت کا اعتراف ہے۔

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑھتا ہے کہ اکابر دیوبند اور محدثین دیوبند کے احوال وکوائف اور سوانحی حالات پر مشتمل کتابوں، تحریروں اور مقالات میں حضرت مولانا شریف صاحب کو وہ حصہ نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ یہ ان کے خصوصی شاگردوں اور خاص طور پر بخاری شریف کے شاگردوں کی کمی یا بے اعتنائی کے زمرے میں شمار کی جائے گی۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت مولانا کے صاحبزادوں میں سے کوئی عالم دین اور فاضل دارالعلوم نہیں ہے، جو اس علمی سلسلے کو آگے بڑھانے اور مولانا کی خدمات کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوتا۔

حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ

دارالعلوم دیوبند میں نصف صدی تک مدرسی اور وہ بھی اس کرّ وفر اور شان کے ساتھ کہ انتظامیہ کو بھی ان کی مرضی اور صوابدید کے پہلو کو نظر انداز کرنے کی جرأت کرنے کے لیے بار بار غور کرنا پڑے اور جنھوں نے ابتدائی کتب سے لے کر بخاری شریف تک کا درس دیا ہو اور طلبہ میں مقبول بھی ہوں، اگر کوئی نام سرفہرست آتا ہے تو وہ ہے حضرت مولانا فخر الحسن علیہ الرحمہ کا، جو عام طور پر طلبہ میں چچا فخر الحسن یا صرف ''چچا'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

ان کا آبائی وطن قصبہ عمری کلاں ضلع مرادآباد ہے، مگر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت عربی مدرّس کے ان کا تقرر ہوا تو دیوبند ہی میں مقیم ہوگئے، تقسیم ہند سے پہلے آئے اور اب دیوبند ہی ان کا وطن ہوگیا۔

طلبہ سے سنا کرتا تھا کہ بیحد لائق وفائق اور ممتاز صلاحیت کے حامل استاذ ہیں، اور ہر فن کی ہر کتاب کی تدریسی لیاقت رکھتے ہیں، مگر راقم الحروف کو ان سے استفادے کا موقع ملا ۱۹۷۱ء میں جب ان کے پاس ترمذی شریف مکمل بشمول شمائل ترمذی پڑھنے کا موقع میسر آیا، یہ زمانہ ان کے ضعف کا تھا، ابھی حافظہ متأثر نہیں ہوا تھا، مگر درس میں ان کی مشہور شان کم ہوچکی تھی، اس کے باوجود ترمذی شریف کا ان کا درس امتیازی شان لیے ہوئے تھا، مسلسل دو گھنٹے کا سبق ہوتا، تازہ مطالعے سے کم اور گذشتہ تجربات سے وہ طلبہ کو نہ صرف مطمئن کرتے بلکہ دورانِ

درس کبھی عربی میں بھی خطاب کرتے، بلاشبہ وہ طلبہ کی نفسیات سمجھنے میں تمام اساتذہ سے زیادہ تجربہ اور درک رکھتے تھے، اس لیے طلبہ کی تفہیم میں وہ تمام طریقے اپناتے جس سے حق درس بھی ادا ہو، طلبہ بھی مطمئن ہوں اور ان کا علمی رعب کم نہ ہو، ہمیں بھی محسوس ہوتا تھا کہ حضرت اپنی جوانی اور تدریس کے دور شباب میں کس شان کے حامل رہے ہوں گے۔

دورۂ حدیث میں عربی میں بیان اور تدریس کا معمول صرف شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا تھا مگر ان کے علاوہ صرف حضرت مولانا فخر الحسن صاحب ہی اس زمانے میں تھے جو بسا اوقات عربی میں بھی بیان کردیتے تھے، اور جب کسی مسئلے پر اپنی حتمی رائے پیش کرتے تو ان کا یہ قول مشہور تھا:

"من ادّعی غیر ذلک فعلیہ البیان الی نھایۃ شعبان"

خاص طور پر جب کوئی طالب علم کسی بحث میں اعتراض کرتا یا استفسار کرتا اس وقت وہ اپنے پرانے رنگ میں لوٹ جاتے اور لمبی چوڑی تقریر فرماتے، تمام اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب دیتے۔

ان کا درس ترمذی بھی معروف تھا اور تفسیر بیضاوی سورۂ بقرہ بھی، بیضاوی کا سبق کتنے طویل عرصے سے ان سے متعلق تھا کچھ معلوم نہیں لیکن بیشتر اساتذہ بھی یہی کہتے کہ ابتدا ہی سے غالباً یہ سبق ان سے متعلق ہے، اور تفسیر بیضاوی پڑھنے یا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہوگا کہ اس تفسیر میں نحو و صرف، تراکیب، حل لغات اور معانی و بیان و ربط آیات پر کتنا زور دیا گیا ہے، اس کا حق ادا کرنے کے لیے ان سارے علوم پر عبور ضروری ہے اور حضرت مولانا میں یہ خوبی موجود تھی، حضرت مولانا کی خاص پہچان طلبۂ دار العلوم میں جلسۂ انعامیہ کی نظامت بھی تھی، یا غلہ اسکیم کے جلوس کی نظامت، شوخی، طنز و تعریض، پر لطف انداز تکلم اس نظامت کا خاص

انداز تھا اور طلبہ بیحد پسند بھی کرتے تھے۔

گو کہ مولانا تصنیف و ترجمہ کے لیے وقت نہ نکال سکے مگر ان میں اس کی صلاحیت بھی تھی، پھر ان کے لائق و فائق شاگرد مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری اور مولانا جمیل احمد سکروڈویؒ (سابق اساتذہ دارالعلوم دیوبند) نے ان کے درسی افادات کو مرتب کیا اور تفسیر بیضاوی کی شرح ''تقریر حاوی'' تین حصوں پر مشتمل ایک جلد میں شائع ہوئی جو طلبہ کے لیے سب سے بڑا مرجع ہے۔

حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کی رحلت کے بعد وہ دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرّسین بھی ہوئے اور کچھ عرصہ بخاری شریف کا درس بھی دیا۔

حضرت مولانا اگرچہ انتظامی شعبے سے متعلق نہیں رہے، مگر ہر اہم مسئلے میں اور ہمیشہ ان کی رائے ضرور لی جاتی، وہ طلبہ کی ہنگامی زندگی کے بعض انتشار اور خلفشار کو قابو میں کرنے کے ماہر گردانے جاتے تھے۔

تدریس کے علاوہ ان کے دعوتی و تبلیغی اسفار بھی ہوتے، خاص طور پر ضلع مظفرنگر کے گاؤں اور قصبوں میں اور دینی مدارس میں ان کا ایک زبردست حلقہ تھا، جہاں کے وہ دورے بھی کرتے اور جلسوں میں شرکت کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں خطاب بھی کرتے۔

اخیر عمر میں ضعف اور بڑھا، حافظہ متأثر ہوا، اور اپنے ایک جوان العمر لڑکے مولانا بہاء الحسن (استاذ دارالعلوم دیوبند) کے انتقال سے وہ بیحد مضمحل ہو گئے، بالآخر ۱۹۷۸ء میں ان کا انتقال ہوا، دیوبند کے قبرستان قاسمی میں ان کا مزار ہے۔

شیخ الحدیث
حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ

ولادت ۱۳۰۷ھ وفات ۱۳۹۲ مطابق ۱۹۷۲ء

دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الحدیث'' کا منصب یا رتبہ ایک بیحد قابل احترام وعقیدت عنوان ہے، جو ادارے کی اہم ترین شخصیت کی پہچان بھی ہے، شیخ الحدیث کا مطلب صرف بخاری شریف کی تدریس نہیں بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ جو اس مقام پر فائز ہیں وہ علم حدیث میں ماہر، دیگر دینی علوم پر گہری بصیرت رکھنے والے، صالح، متقی، نورانی صورت وسیرت کے حامل، طلبہ واساتذہ کے مرجع اور اربابِ حل وعقد کے لیے بھی معزز اور مستند شخصیت کے مالک ہیں، عام طور پر دینی مدارس میں ذمہ دار اعلیٰ مہتمم یا ناظم کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور ان میں شیخ الحدیث کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، مگر دارالعلوم دیوبند میں دونوں شخصیتیں (مہتمم اور شیخ الحدیث) یکساں حیثیت اور رتبہ کی حامل خیال کی جاتی رہی ہیں، دستوری طور پر جو عہدہ جس مرتبے کا ہو مگر دیوبند میں شیخ الحدیث کا رتبہ کسی طور پر مہتمم سے کم نہیں ہوتا۔

فضلائے دارالعلوم اور اہل علم بسا اوقات مہتمم سے زائد ''شیخ'' کو یاد کرتے اور رکھتے ہیں۔ دیوبند میں علم حدیث کی سند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے واسطے سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ تک پہنچتی ہے، اور درسگاہ میں

پہلے شیخ کے طور پر انھیں کا نام زباں زد ہے، گرچہ ان کے شیخ اکابر دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی ہیں۔

اس طرح شیخ الحدیث کا لقب حضرت شیخ الہند سے ہوتا ہوا حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا فخر الدین رحمہم اللہ تک پہنچتا ہے، مؤخر الذکر تینوں مشائخ حضرت شیخ الہند کے شاگرد ہیں اور مذکورہ ترتیب سے ہی تینوں حضرات دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے۔

حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں سے حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ ہی آخری شاگرد ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الحدیث'' رہے، اس لحاظ سے راقم الحروف کو یہ سعادت حاصل ہے کہ صرف ایک واسطے سے حضرت شیخ الہند کا شاگرد ہے۔

فللہ الحمد

۱۹۷۱ء میں ہمارا دورۂ حدیث کا سال ہے، دورۂ حدیث یعنی ''فضیلت'' کا آخری سال، دورۂ حدیث کا دوسرا مطلب یہ کہ اس سال صرف حدیث کی کتابیں زیر درس ہوں گی اور دیوبند میں دورۂ حدیث کا مفہوم یہ بھی کہ حدیث کی دس معروف ومستند امہات الکتب شامل نصاب ہیں:

۱- بخاری شریف	۲- مسلم شریف
۳- ترمذی شریف	۴- ابوداؤد شریف
۵- نسائی شریف	۶- ابن ماجہ شریف
۷- شمائل ترمذی	۸- طحاوی شریف
۹- مؤطا امام مالکؒ	۱۰- مؤطا امام محمدؒ

ان میں سے بیشتر کتابیں مکمل پڑھائی جاتی رہی ہیں، البتہ یہ ہمیشہ ہی ہوا ہے کہ ابتدائی نصف سال میں حدیث کی تمام کتابوں کے ابتدائی ابواب پر مفصل

بحث ہوتی ہے، حدیث کی تشریح، عبارت کا حل پھر فقہی مباحث، حدیث سے مستنبط ہونے والے مسائل پر سیر حاصل بحث، ائمہ حدیث اور فقہاء کرام کی آراء اور ان کے دلائل وغیرہ۔ پھر کتاب کی تکمیل کے پیش نظر بعد میں یہ بحث مختصر ہوجاتی، ترجمہ، تشریح اور مطلب پر اکتفا ہوتا۔ اگر کتاب اب بھی پوری نہ ہوتی ہوتو حدیث کی عبارت خوانی۔

البتہ بخاری شریف کے سلسلے میں یہ التزام ہوتا کہ اس کی تدریس مکمل وضاحت اور تفصیل سے ہی ہو، چنانچہ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ اس پر قائم رہتے جس کے لیے انھیں اضافی وقت درکار ہوتا تھا، اس لیے عام طور پر بخاری جلد اوّل صبح کے اوقات میں ۲-۳ گھنٹے تک پڑھاتے تھے اور بخاری جلد ثانی کا بعد نماز عشاء دو گھنٹے کا درس ہوتا۔ اس طرح عام طور پر حضرت شیخ بخاری شریف روزانہ چار، پانچ گھنٹے پڑھاتے اور طلبہ پابندی کے ساتھ بالالتزام اس میں شریک ہوتے۔

۱۹۷۰ء سے کچھ عرصہ قبل حضرت شیخ کافی ضعیف ہوچکے تھے، بیماری کا عارضہ بھی لاحق ہونے لگا تو حضرت نے دارالعلوم کے اربابِ حل وعقد سے اپنے سبق میں تخفیف کی گذارش کی، اس طرح جلد اوّل اور صبح کے تین گھنٹے ان کے لیے مختص رکھے گئے، جلد ثانی بعد نماز عشاء حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ سے متعلق کردی گئی، مفتی صاحب نے درس میں اختصار کو ملحوظ رکھا۔

۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ھ میرے دورۂ حدیث کا سال، جس جماعت میں اس وقت تین سو سے کچھ زائد طلبہ شریک درس تھے، اور حضرت شیخ الحدیث کے مکمل تعلیمی سال کا آخری سال، انھوں نے شوال کے بعد سے شعبان کے اخیر تک بخاری شریف جلد اوّل کا درس دیرینہ روایت اور اپنے مخصوص انداز سے دیا تھا اور آئندہ سال یعنی ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ میں درس کی ابتدا فرمائی اور عیدالاضحیٰ کی

تعطیل تک درس دیا پھر مرض کی شدت کی وجہ سے مراد آباد تشریف لے گئے اور اسی سال ان کی وفات ہوگئی۔

●●●

حضرت شیخ الحدیث کی ولادت ۱۳۰۷ھ میں بمقام اجمیر ہوئی، ابتدائی تعلیم مختلف اداروں اور اساتذہ سے حاصل کی، اور اب والد اور اہل خاندان کے ہاپوڑ ضلع غازی آباد منتقل ہونے کے بعد وہی ان کا وطن ہوگیا، مگر پے بہ پے اہل خانہ کے ساتھ حادثات پیش آتے رہے، ایک ہی سال میں ان کے بڑے بھائی، والدہ محترمہ، دادا جان اور پھر والد محترم کا انتقال ہوگیا، ان ابتلاء وآزمائش میں ان کی تعلیم بھی موقوف ہوگئی، مگر پھر ان کے ماموں جناب سید اسماعیل صاحب نے سرپرستی فرمائی اور تعلیم کی تکمیل کے لیے دیوبند بھیج دیا، ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور امتحان داخلہ خود حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے لیا اور انعامی نمبر دیئے، اور اپنے استاذ و شیخ کی ہدایت کے بموجب انھوں نے دورۂ حدیث کی تکمیل دو سال میں کی۔ حدیث کی کتابوں کے علاوہ فنون کی دیگر کتابیں (ہدایہ اخیرین، بیضاوی، جلالین، توضیح، حسامی، دیوان متنبی، حماسہ اور تفسیر مدارک) بھی مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد خود ارباب حل وعقد دارالعلوم نے ابتدائی جماعتوں کی تدریس کے لیے دارالعلوم دیوبند ہی میں تقرر کرلیا جہاں وہ تین سالوں تک تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر خود دارالعلوم کے صدر مہتمم نے باقاعدہ مدرّس بنا کر مدرسہ شاہی مراد آباد بھیج دیا، جہاں مستقل طور پر آپ مقیم رہے اور اب مراد آباد ہی حضرت کا وطن ہوگیا، اس دوران حضرت نے ملکی سیاست میں بھی دلچسپی رکھی، پھر اکابر علمائے دیوبند کی طلب پر دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں

عارضی طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس کے لیے تشریف لائے، خاص طور پر جب حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے قید و بند میں رہے، تب حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی جگہ پر قائم مقام صدر المدرسین کی حیثیت سے بلایا گیا اور بخاری کی تدریس ان سے متعلق کی گئی۔

اور جب ۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۷ھ میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا تو دار العلوم دیوبند کے اس عظیم منصب ''شیخ الحدیث'' کے لیے ذمہ داران دار العلوم کو کسی اور شخصیت کی تلاش کی ضرورت ہی نہیں رہی، حضرت مدنی کی زندگی ہی میں انھوں نے ان کے جانشین کی حیثیت سے دار العلوم کی خدمت انجام دی تھی، اس لیے سبھوں کی نظر انتخاب ان پر پڑی، اور انھیں مرادآباد سے دیوبند بلایا گیا، اس طرح اخیر عمر تک انھوں نے دار الحدیث کی عظمت کو اپنی صلاحیت، انفرادیت اور خوبیوں سے دوبالا کر دیا، پندرہ سالوں پر محیط ان کی یہ زندگی یکسوئی کے ساتھ مشغولِ خدمتِ حدیث ہوگئی۔ اگرچہ اس دوران ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک وہ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر کے عہدے پر فائز رہے مگر عملی سیاست میں سرگرمیاں کم ہوگئیں، عام طور پر دار العلوم دیوبند میں طریق کار یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند یا ان کے جانشینوں کے دور میں جو ''شیخ الحدیث'' ہوتے تھے وہی صدر المدرسین بھی ہوا کرتے تھے، چنانچہ اخیر میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ تک یہی معمول رہا کہ وہ شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے، اب جب حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی دار العلوم میں شیخ الحدیث کے بطور مقرر ہوئے تو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ تو مہتمم تھے مگر حضرت شیخ الہند کے ایک لائق ترین اور جامع العلوم باصلاحیت شاگرد موجود تھے وہ تھے امام المعقولات حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ، ان

کی شخصیت وصلاحیت اور دارالعلوم میں ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو صدرالمدرّسین بنایا گیا، اس طرح اب یہ دونوں منصب الگ ہو گئے، پھر جب ۱۹۶۷ء میں حضرت علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو حضرت مولانا فخر الدینؒ کو صدرالمدرّسین بھی منتخب کیا گیا اور اخیر عمر تک شیخ الحدیث وصدرالمدرسین رہے۔

اس کے بعد کے زمانے میں بھی شیخ الحدیث اور صدرالمدرّسین کا عہدہ کبھی الگ رکھا گیا اور کبھی دونوں ایک شخصیت سے متعلق رہا۔

حضرت شیخ نے ۱۹۷۲ء کی ابتدا میں درس شروع فرمادیا، مگر ضعف بڑھتا گیا، بالآخر ۲۵/اپریل کو مرادآباد ہی میں وہ رحلت کر گئے، ان کی نماز جنازہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے پڑھائی۔

● ● ●

جب ۱۹۶۸ء میں احقر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو اکابر و اساتذہ کی صف میں یکتائے زمانہ شخصیتیں موجود تھیں، علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال رمضان ہی میں ہو چکا تھا، مگر حضرت شیخ الحدیث اور حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا مبارک علی نائب مہتمم، مفتی محمود حسن گنگوہی وغیرہم جیسے حضرات موجود تھے اور ان کا فیضانِ علم ونور جاری تھا، پھر بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمارے ذہنوں میں حضرت شیخ کی عظمت بلاشبہ سب سے زیادہ تھی، اس لیے بہت سے وہ طلبہ جو دورۂ حدیث میں داخل نہیں تھے وہ بھی حضرت شیخ کے درس میں بیٹھ کر ان سے استفادہ کو فخر وسعادت سمجھتے تھے، ہمیں یہ موقع اس وقت ملتا تھا جب صبح کے چار گھنٹوں کی تعلیم سے فراغت ہو جاتی اور دارالحدیث (تحتانی) میں بخاری کا درس جاری رہتا، اسی وقت سے دل میں یہ تمنا اور زبان پر دعا ہوتی کہ اللہ کرے ہمیں بھی حضرت شیخ سے بخاری شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہو جائے۔

اللہ نے ہماری آرزو پوری کردی اور باضابطہ دورۂ حدیث کا طالب علم ہو کر حضرت شیخ الحدیث کے درس میں جا کر سب سے پہلے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ شیخ کے سامنے سب سے پہلی صف میں جگہ ملے اور تقریباً ہمیشہ ہی کامیابی ملی۔

حضرت شیخ اپنی قیام گاہ (متصل دارالشفاء) سے اپنے خادم خاص مکّی بھا گلپوری کے ساتھ دارالحدیث میں جلوہ گر ہوتے، مسند پر تشریف فرما ہوتے، تخت پر نشست ہوتی اور سامنے ڈیسک جس پر بخاری شریف اور ٹیبل لیمپ، حضرت چہار زانو بیٹھتے، سر پر ٹوپی کے ساتھ سفید رومال، نحیف الجثہ، متوسط قد، خوبصورت گورا رنگ، نورانیت اور روحانیت نے شان وشوکت کو دوبالا کیا ہوا، تقریباً تین گھنٹے کی نشست لیکن پہلو بدلنے کی حاجت نہیں، حدیث کی برکت اور روحانی طاقت۔ اور یہی صورتحال سال بھر تک رہی۔

عام طور پر حضرت کا معمول درس میں یہ ہوتا کہ پہلی سہ ماہی تک نصف وقت اردو میں درس دیتے اور نصف اخیر میں عربی زبان میں، دراصل اس زمانے میں دورۂ حدیث میں خاص طور پر کیرالوی طلبہ کی معتد بہ تعداد ہوتی، ملیشیاوی طلبہ کی بھی بڑی تعداد ہوتی تھی، جو اردو بہ مشکل سمجھ پاتے، ان کی رعایت سے تین مہینوں تک اردو اور عربی میں سبق جاری رہتا، پھر جب وہ طلبہ بھی اردو سے مانوس ہو جاتے تو صرف اردو ہی میں بیان ہوتا۔

حضرت کا درس تفصیلی ہوتا اور انداز خطابی، مگر یکساں اور نہایت شیریں لہجہ، ہر لفظ واضح، سلیس انداز بیان اور روانی اس درجہ کہ اگر کوئی زود نویس ان کی تقریرِ درس کو قلمبند کرنا چاہتا تو لفظ بہ لفظ بھی لکھ سکتا تھا، بہت سے طلبہ ان کی درسی تقریر کو کاپیوں میں لکھتے تھے، میں بھی ان کی تقریر قلمبند کرتا تھا اور اچھی طرح یاد ہے کہ

بیشتر حصہ ان کی زبان سے ادا ہوئے کلمات پر ہی مشتمل ہوتا تھا اور بحمداللہ آج تک میرے پاس ان کا وہ درس کاپیوں کی شکل میں موجود ہے، سوائے چار یا پانچ دنوں کے جب میں بیمار پڑ گیا، ورنہ کبھی بھی غیر حاضری نہیں ہوئی۔

بخاری شریف کی حدیث (عبارت) پڑھنے کا بارہا اتفاق ہوا، ایک دفعہ انھوں نے ایک غلطی پر ٹوکا اور فرمایا کہ یہ اعراب کیوں؟ اپنے طور پر میں نے جواب دیا، حضرت نے فرمایا تحقیق کر لینا، بعد میں غور کیا تو معلوم ہوا میری غلطی تھی مگر حضرت نے کتنی خوبی سے اس پر متنبہ فرمایا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا درس اپنی تفصیل، تشریح، خوش کن لہجے اور شیریں آواز کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہا، بخاری شریف کے درس اور موقع بہ موقع علمی نکات پر متوجہ کرنے کی وجہ سے حضرت کا مقام نہایت بلند رہا۔

تراجم بخاری پر حضرت کا کلام بھی نہایت مفید اور پُر از علم ہوا کرتا تھا، غالباً حضرت کو اس میں قدرت کاملہ حاصل تھی، اس لیے تو انھوں نے ترجمۃ الباب پر دو تصنیفات بھی چھوڑیں، القول الفصیح اور القول النصیح ۔ یہ دونوں کتابیں اب بازار میں دستیاب نہیں ہیں، لائبریریوں کی زینت ہیں یا پھر ان کے شاگرد رشید ممتاز عالم دین وادیب حضرت مولانا ریاست علی بجنوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں مل سکتی ہیں۔

شعبۂ کتابت اور اساتذہ

دارالعلوم دیوبند کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد کا ذکر پہلے آچکا ہے، فضلائے دیوبند نے عام طور پر دیوبند سے فراغت کے بعد دینی مدارس میں درس وتدریس یا مساجد میں امامت وخطابت کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں، مگر یا تو ان ہی افراد میں سے یا پھر مستقل طور پر کچھ فضلاء نے الگ سے علوم دینیہ کے شعبوں یا دین وملت کے تقاضوں کی تکمیل میں ترجمہ وتحقیق، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، افتاء وقضاء، رشد وہدایت، اصلاح وطریقت، انشاء وصحافت اور ملکی قیادت کے میدانوں میں بھی قدم رکھے اور اپنی صلاحیتوں اور اخلاص ونیک نیتی کے ذریعہ گراں قدر خدمات انجام دیں، بہت سے فضلاء نے ملک وبیرون ملک تجارت وملازمت اور زراعت کے پیشے کو بھی اپنایا، معاش کے لیے دنیاوی وسائل اختیار کئے، جائز اور حلال طریقے سے روزی کمانے کے مختلف طریقے بھی اپنائے، ساتھ ہی ایک عالم دین ہونے کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں، اسی طرح کچھ فضلائے دیوبند نے فراغت کے بعد عصری علوم کی جانب توجہ دی اور ہند وبیرون ہند کی تعلیم گاہوں (کالج، یونیورسٹی) میں مزید تعلیم حاصل کی، جس کی وجہ سے وہ سرکاری ملازمتوں سے بھی وابستہ ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

مگر چوں کہ بنیادی طور پر دارالعلوم دیوبند کی تعلیم سے حصول دنیا ومادّی فوائد

مقصود نہیں رہے اس لیے نصاب میں عصری ضرورتوں کو بنیاد نہیں بنایا گیا، خدمت دین، دینی علوم کی نشر واشاعت اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی اس کی اہم بنیاد تھی، اس راہ میں صبر وشکر، توکل وقناعت اور قدر ضرورت معاش ہی ان علمائے دین کا مطمح نظر رہا ہے۔

بیسویں صدی میں دنیا بھر میں مختلف النوع انقلابات رونما ہوئے، دو عظیم عالمی جنگیں بھی اسی زمانے نے دیکھیں، پھر ہمارے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات بھی ملی، ملک تقسیم بھی ہوا، اور اسی صدی میں دنیا کے سامنے ایسے نظریات سامنے آئے جن کی بنیاد ہی مادّی امور اور سرمایہ تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام، پھر اشتراکی نظریہ اور سوشلسٹ نظامہائے زندگی جن کا مقصد ہی دنیا اور دنیاوی وسائل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا اس سے متاثر ہوئی، دین، روحانیت، آخرت اور رضائے الٰہی جیسے عنوانات ثانوی حیثیت اختیار کرنے لگے، مسلمانوں میں بھی سائنسی ترقیات کی چکا چوند اور مغربی ممالک سے مرعوبیت کے جراثیم داخل ہونے لگے، اور بہت سے افراد یا جماعتوں اور خاص طور پر اسلام دشمن عناصر کی طرف سے یہ پروپیگنڈے اور تشہیری مہم شروع ہوگئی کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل افراد دنیا میں زندگی گذارنے کے لیے معاشی وسائل سے محروم ہیں۔

اور گذشتہ چند دہائیوں سے تو یہ آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہونے لگی ہے جس کا جواب وقتاً فوقتاً یہ اہل مدارس اور علمائے دین و دانشوران حسب ضرورت دیتے رہتے ہیں، یہاں ان کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔

مگر اکابر دیوبند یعنی دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے کسب معاش کیلئے مناسب وضروری وسائل اختیار کرنے کی ہمیشہ ترغیب دی ہے، صبر وقناعت اور خدمت دین کے مخلصانہ عمل کی ترغیب کے ساتھ دنیوی وسائل اختیار کرنے سے

گریز کرنے پر بھی زور نہیں دیا، اسی لیے ذمہ داران دارالعلوم نے ضرورت محسوس کی تو خود فضلائے دیوبند کے لیے بعض عملی راہیں بھی اپنائیں۔ فراغت کے بعد کسب معاش کے بعض ذرائع کی تعلیم وتربیت کے شعبے خود دارالعلوم نے قائم کئے، اس ضمن میں ایک شعبہ ''دارالصنائع'' کے نام سے قائم ہوا جس میں خیاطی اور جلد سازی کی تربیت دی جانے لگی، اسی سلسلے کی ایک کڑی شعبۂ خطاطی وکتابت بھی ہے، جس میں اردو اور عربی خطاطی کی تعلیم وتربیت کا نظم قائم ہوا، اور اس کے لیے باضابطہ تین ماہر معلّمین مامور ہوئے۔

آزادی کے بعد دارالعلوم کے فضلاء کو طب یونانی کی تعلیم دینے کے لیے ماہر اطباء کی خدمات حاصل کی گئیں، طب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ ان اساتذہ سے کتابوں کا درس بھی لیتے اور دواسازی ونسخہ نویسی کی تربیت بھی حاصل کرتے، اس کے بعد جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کے نام سے باضاطہ طب یونانی کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ بھی قائم ہوا جس میں تکمیل الطب کا نصاب جاری ہوا جو چہار سالہ کورس پر مشتمل تھا اور اس کی سند حکومت سے منظور بھی تھی جو سند تکمیل الطب (ڈپلومہ اِن یونانی میڈیسن DUM) کے نام سے موسوم رہی۔

ساٹھ کی دہائی میں دارالعلوم دیوبند نے انگریزی تعلیم کا دو سالہ نصاب بھی جاری کیا جو عرصۂ دراز تک جاری رہا۔

یہاں ذکر شعبۂ کتابت کا ہے جس سے راقم الحروف نے دو سال تک داخل ہو کر تعلیم وتربیت پائی، اس شعبہ کے سربراہ حضرت مولانا اشتیاق احمد قاسمی تھے اور ان کے دو معاون اساتذہ منشی شکور احمد اور منشی امتیاز احمد صاحبان تھے۔

باضابطہ شعبۂ خوشخطی کا قیام ۱۳۶۴ھ میں عمل میں آیا، جس کا مقصد طلبہ کے خط کی درستگی اور حسن تحریر تھا، جس میں خط نسخ اور خط نستعلیق دونوں کی مشق کا نظم رہا،

حسن تحریر کے علاوہ اس شعبہ کا مقصد یہ بھی تھا کہ جو طلبہ خوش نویسی کی تعلیم بحیثیت فن حاصل کرنا چاہیں ان کو فنی لحاظ سے مشق کرائی جائے اور یہ طلبِ معاش کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔

میں نے ۱۹۷۲ء میں تکمیل ادب عربی سے فراغت حاصل کرلی تھی اور عربی خطوط پر کافی حد تک مشق بھی ہوچکی تھی، شعبۂ کتابت میں داخلے کے بعد اردو (خط نستعلیق) اور خط نسخ (عربی) کی تکمیل کی، مگر اس سے پہلے ہی عربی کے جدید خطوط جو حاصل کئے اور مزید اس میں کوششیں جاری رکھیں وہ سب ادیب زماں حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کے طفیل تھے، حضرت مولانا عربی زبان و ادب کے ماہر تو تھے ہی، عربی اور اردو کتابت پر کامل قدرت رکھتے تھے، اور عرصۂ دراز تک اس کو کسب معاش کا ذریعہ بھی بنایا، ۱۹۷۳ء میں حضرت نے ایک دن بلایا اور اپنی تحریر کردہ کچھ کتابیں بھی دکھائیں اور فرمایا کہ اب تھک چکا ہوں، کتابت مشکل ہورہی ہے، اس لیے یہ ذمہ داری اب تم لوگ سنبھالو، پھر انھوں نے ''دعوۃ الحق'' کے بعض شماروں کی کتابت بھی مجھ سے متعلق کردی تھی، یہ وہ وقت تھا جب دیوبند یا اس کے قرب و جوار میں عربی ٹائپ کے پریس بھی نہیں تھے، دعوۃ الحق یا تو سرائے میر اعظم گڑھ سے طبع ہوکر آتا یا حیدرآباد سے۔

واضح ہو کہ **''القاموس الجدید''** اردو-عربی، عربی-اردو دونوں اور **''القراءۃ الواضحۃ''** کے سارے حصے خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خوش خطی کا نمونہ تھے، بعد کے ایڈیشن میں دوسرے خطاط یا کمپیوٹر کا سہارا لیا گیا ہے۔

مولانا شکور احمد (خطّاط)

دارالعلوم دیوبند میں راقم السطور کا پہلا سال تھا، نصابی کتابوں کے علاوہ اس سال مجھے دو خصوصی علمی فائدے ہوئے، ایک تو عربی زبان کی تمرین کے لیے صف ابتدائی میں شرکت اور طبعی طور پر دلچسپی بھی، ویسے یہ گھنٹہ لازمی تھا، دوسرا جو فائدہ حاصل ہوا وہ اصلاح خط اور تحسین کے نام پر شعبۂ کتابت سے وابستگی، اردو قلمی تحریر کی تحسین کا جذبہ دل میں تھا، مستزاد یہ کہ کسی کرم فرمانے مشورہ دے دیا کہ خارج اوقات میں خوشخطی کی مشق کے لیے شعبۂ کتابت میں نام لکھوالو، اللہ اس مشیر کو جزائے خیر دے جس کی ہدایت پر شعبۂ کتابت پہنچ گیا۔

اس شعبے کا مقصد ہی تحریر کی اصلاح و تحسین تھی، البتہ جو طلبہ فنی مہارت حاصل کر کے باضابطہ خطاط بننا چاہتے ان کے لیے سال بھر کا مکمل نصاب تھا، اصلاح خط اور ابتدائی خوش خطی کی مشق کے لیے دو اساتذہ متعین تھے، میرے لیے استاذ متعین ہوئے حضرت مولانا شکور احمد صاحب بن حضرت مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندی مرحوم۔

درسگاہ میں استاذ کے سامنے حاضری دی تو دیکھا نہایت نفیس، خوبصورت مردانہ وجاہت کے حامل نورانی چہرہ لیے جو شخصیت ہے وہ بجائے کاتب یا خطاط کے ایک متقی بزرگ ہیں، متواضع اور منکسر المزاج، محسوس ہوا کہ اصلاح خط کی بجائے اصلاح نفس کے لیے ایک پیر موجود ہیں۔ گفتگو بھی سنجیدہ بہت نرمی کے ساتھ، ایک استاذ معلّم کا جو تصور طالب علم کو ہوسکتا ہے اس سے قطعی الگ، طبیعت

بیحد مانوس ہوئی، دل میں عقیدت کا اثر ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختیاری مضمون ہونے کے باوجود از خود روزانہ پابندی کا خوگر ہوگیا، بلاشبہ یہ سب ''منشی شکور احمد'' کی شخصیت کا اثر تھا۔

مولانا شکور احمد ۸/رجب ۱۳۴۵ھ میں دیوبند ک ایک نامور عالم دین مولانا ظہور احمد مدرّس دارالعلوم دیوبند کے گھر پیدا ہوئے، ابتدائی دینیات کی تعلیم گھر میں مکمل کی، پھر فارسی اور ریاضی کی تکمیل دارالعلوم سے کی، عربی کی مکمل تعلیم بھی دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، اس کے بعد ہی عربی اور اردو رسم الخط میں خوش خطی (کتابت) استاذ الاساتذہ حضرت مولانا اشتیاق احمد دیوبندی سے مکمل کی۔

مولانا شکور احمد صاحب اسی خاندان کے فرد ہیں جن کو اللہ نے علم دین کی دولت سے نوازا ہے، اور دینی علوم کی خدمت کی توفیق بھی عطا کی، ان کے برادر حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بحمد اللہ دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث رہے، اوران کے خاندان کی نئی نسل بھی دینی علوم کی درس وتدریس میں دیوبند کے ان دونوں اداروں میں مصروفِ خدمت ہے۔

مولانا شکور احمد صاحب ۱۳۶۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم میں اختلاف ہوا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثانی اور مولانا ظہور احمدؒ مستعفی ہوکر ڈابھیل چلے گئے، جہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا، مولانا شکور احمد صاحب بھی اپنے والد کے ہمراہ ڈابھیل چلے گئے، پھر دیوبند آئے اور یہاں دورۂ حدیث کی تکمیل تقسیم ہند سے پہلے ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۵ء) میں کی۔

مولانا شکور احمد صاحب کو اردو کے ساتھ عربی نسخ میں بھی کمال حاصل تھا اور اپنے استاذ کے معتمد شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے، اس وقت مشہور کتب خانہ

''اصح المطابع'' نے حضرت مولانا اشتیاق احمد مرحوم سے بخاری، مسلم اور مشکوٰۃ وغیرہ کی کتابت کرانے کی درخواست کی جس میں استاذ نے خود اور اپنے معتمد شاگردوں سے یہ کتابیں مکمل کتابت کرائیں جن میں مولانا شکور احمد مرحوم بھی تھے، اس کے علاوہ انھوں نے دیوبند کے ایک معروف ناشر ''راشد کمپنی'' کے لیے قاعدے، سیپارے اور مکمل قرآن مجید کی کتابت بھی فرمائی۔

مولانا کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ دارالافتاء میں ناقل فتاویٰ کے طور پر ہوا، مگر شعبۂ کتابت میں معلّم کی ضرورت پڑی تو انھیں اسی شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور اخیر عمر تک یہیں سے متعلق رہے۔

ان کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوا، مزار قاسمی میں مدفون ہیں۔

ان کے صاحبزادے قاری سرور احمد صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرّس ہیں اور پوتے مفتی محمد نوید دیوبند ہی کے ایک مستند ادارے جامعۃ الامام محمد انور شاہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ

ولادت ۱۳۱۲ھ

دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ کتابت کا اجراء ہوا تو سب سے پہلے صدر شعبہ کے طور پر حضرت مولانا اشتیاق احمد رحمہ اللہ کا تقرر ہوا، کتابت میں وہ ''اعجاز رقم'' والے شمس الدین صاحب کے ایک یا دو واسطے سے شاگرد ہیں، وہ خود کتابت میں بعض طریقوں کے موجد بھی ہوئے، ہندوستان میں رائج بخاری، مسلم، مشکوٰۃ، جلالین وغیرہ جیسی اہم عربی درسی کتابوں کی موجودہ تحریر (رسم الخط) کے بلاشبہ وہ موجد کہلانے کے مستحق ہیں، خط نستعلیق میں کمال مہارت کے ساتھ خط نسخ کے مختلف طرز کی کتابت کے امام ہیں، اور فن خطاطی ان کے خاندان کی پہچان بھی، ان کے صاحبزادگان، صاحبزادی، پوتے، نواسے بحمد اللہ سب معروف خطاط ہوئے ہیں، یہ خطاطی کا فن ان کا اضافی کمال اور ہنر ہے۔

حضرت مولانا ایک ماہر، باصلاحیت عالم دین ہونے کے ساتھ باکمال مصنّف ومترجم بھی تھے، دراصل وہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں رہے، مگر فراغت کے بعد چوں کہ زیادہ توجہ فن خطاطی کی طرف مبذول ہوگئی اور اس کی وجہ سے برصغیر ہندوپاک کے اعلیٰ درجے کے اکابر خوش نویسوں میں شمار کئے جاتے رہے، ورنہ ان کی علمی لیاقت کے نمونے تصنیفات وتراجم ہیں جو آج بھی دینی طبقوں میں مقبول ومعروف ہیں، حضرت مولانا اشتیاق

احمد صاحب کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے علوم سے بڑی مناسبت تھی اس لیے ان کی فارسی کی دو کتابوں ''انتصار الاسلام'' اور ''تعداد رکعات تراویح'' کا اردو ترجمہ کیا، ایک کتاب شواہد نبوت پاکستان میں شائع شدہ ہے، اور ایک اہم کتاب ''سوانح قاسمی'' غیر مطبوعہ، اس کے علاوہ مولانا کے بہت سے نادر و نایاب مسودات تھے جو عدم توجہ کا شکار ہو گئے۔ ایک معروف کتاب جو آج بھی علمی حلقوں میں بیحد مقبول ہے وہ ہے ''لطائف علمیہ''، یہ کتاب دراصل علامہ ابن جوزی کی ''کتاب الاذکیاء'' کا ایسا مستند اردو ترجمہ ہے جس کے بارے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب میری پسندیدہ ہے اور اتنا عمدہ ترجمہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا ایک عالم دین اور رئیس الخطاطین ہونے کے ساتھ ہی صاحب علم و فضل اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے، سلسلۂ قادریہ سے تعلق تھا اور اکابر کے معمولات اور اوراد و وظائف کے پوری طرح پابند تھے۔ اور یہ تو ان کے آخری دور کی بات ہے جب میں نے شعبۂ کتابت میں داخلہ لیا تھا، آنکھوں کے اوپر ایک تسمہ چڑھا لیتے تا کہ بھوؤں کا حصہ نظروں میں حارج نہ ہو اور اصلاح دے سکیں، ہاتھ میں ہمہ وقت تسبیح اور اوراد و وظائف میں مشغول۔

۱۹۷۳ء میں جب میں نے فن کی تکمیل کے مقصد سے داخلہ لیا تو خط نستعلیق کا ایک بڑا حصہ مولانا شکور احمد کے یہاں پورا ہو چکا تھا، اب تکمیل کا مرحلہ تھا، جو بحمد اللہ ایک سال سے پہلے پورا ہو گیا، پھر خط نسخ کی ابتدا ہو گئی، عربی خط (رقعہ، دیوانی اور کوفی) سے واقفیت پہلے ہی ہو چکی تھی اور میں مصری ٹائپ خط میں کتابوں کی کتابت کرنے لگا تھا، مگر اب خط نسخ (عربی ہندی) کی ابتدا تھی جس کے ماہر اور نکتہ داں حضرت مولانا اشتیاق احمد مرحوم تھے، دوران تمرین حضرت کو احقر کے

بارے میں بعض جدید وقدیم خطوط سے آگاہی کا علم ہوگیا تھا، ایک دن حضرت نے خط نسخ خالص عربی پر جب مجھے اصلاح دی تو آج بھی یاد ہے میں ''ہکّابکّا'' رہ گیا تھا، معلوم ہوا حضرت کو اس میں بھی کامل قدرت اور عبور حاصل ہے۔

حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یاد رکھو، شعبۂ کتابت کی سند خوشنویس کا قلم اور اس کی تحریر ہے۔ الحمد للہ راقم الحروف اپنے ان تینوں اساتذہ (حضرت مولانا اشتیاق احمد، حضرت مولانا شکور احمد اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب) کی دعاؤں اور ہدایتوں کی بدولت عرصۂ دراز تک فن خطاطی میں ایک اہم نام شمار کیا جاتا رہا۔ عربی کی بڑی چھوٹی درجنوں کتابوں اور سیکڑوں عربی اردو کے ٹائٹل، طغرے اور سندات وغیرہ کی کتابت وتزئین کی۔

دارالافتاء
دارالعلوم دیوبند میں

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جن حالات میں پڑی اس وقت ہندوستان کے قدیم دینی مدارس تقریباً ختم ہو چکے تھے، اور بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد تو علماء دین خاص طور پر انگریز حاکم کی قتل وغارت گری اور بربادی کے شکار ہوئے، ایسے میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد صرف دینی تعلیم کی حفاظت کے لیے نہیں تھی بلکہ ایمان وعقیدے کے تحفظ کے علاوہ تمام دینی امور میں ان کی رہنمائی کیلئے بھی تھی، پیش آمدہ مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے حل پیش کرنا بھی دارالعلوم کے اغراض ومقاصد میں شامل تھا۔

اس لیے دارالعلوم کی ابتدائی زندگی میں شرعی احکام واضح کرنے یا دینی امور میں فتویٰ دینے کی ذمہ داری خود اکابر دارالعلوم نے انجام دی، درس وتدریس کے علاوہ افتاء کا کام سب سے پہلے اوّلین صدر المدرّسین حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ انجام دیتے رہے، ان کے بعد مختلف اساتذہ سے یہ کام لیا جاتا رہا، مگر استفتاء کی تعداد بڑھتی گئی تو ذمہ داران دارالعلوم نے باقاعدہ شعبۂ ''دارالافتاء'' ۱۳۱۰ھ میں قائم کیا اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کو مفتی کے عہدے پر مامور کیا گیا، اس کے ساتھ ہی ان فتاویٰ کی نقول بھی دارالافتاء کے رجسٹر میں محفوظ کی جانے

لگی، بعد میں ان فتاویٰ کو مرتب کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کیا گیا، جمع و ترتیب کا یہ اہم کام ایک باصلاحیت عالم دین اور انشاء پرداز قلم کار و مفتی حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے انجام دیا، اب ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کی ۱۴؍ سے زائد جلدیں طبع ہو کر آچکی ہیں، اور ارباب فقہ و افتاء کے نزدیک نہایت مستند و معتمد فتاویٰ کا مجموعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کی اہم خدمت انجام دینے والوں میں مفتی عزیز الرحمٰن کے علاوہ شیخ الفقہ والادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مفتی محمد سہول بھاگلپوری، مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری رحمہم اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم کے ذمہ داران نے محسوس کیا اور ملک سے بھی تقاضے آنے لگے کہ اب ہر علاقے میں دارالعلوم کے تربیت یافتہ مفتی ہوں جو علاقائی طور پر شرعی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کر سکیں، تو دارالافتاء میں تدریس، تربیت اور تمرین فتاویٰ کی ابتداء ہوئی، جس میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کرنے والے ممتاز اور چند باصلاحیت افراد کو داخلہ دے کر ان کو فتاویٰ نویسی کی مشق اور افتاء کے اہم امور اور باریکیوں سے واقف کرایا جاتا ہے، نصاب کی تکمیل کے بعد امتحان میں کامیابی کی شرط کے بعد ان کو ''مفتی'' ہونے کی سند دی جاتی ہے۔

۱۹۷۵ء میں احقر نے دارالافتاء میں داخلہ لیا، اس زمانے میں صرف دس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا تھا، دورۂ حدیث میں نمایاں کامیابی اور دیگر تکمیلات میں امتیازی درجہ حاصل کرنا دارالافتاء کے داخلے کے لیے ہمیشہ لازمی شرط ہے، اسی طرح دارالافتاء سے فراغت کے بعد دوسرے کسی شعبے میں داخلے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

میری فراغت ۱۹۷۱ء میں ہو چکی تھی، ایک سال تخصص فی الادب العربی اور

دوسال تکمیل خطاطی کے بعد دارالافتاء میں شریک ہوا، رفقائے درس میں ہم میں سب سے قدیم مولانا محمد قاسم امروہوی (مرحوم) تھے جو چند سال سہارنپور کے کسی مدرسے میں عربی درجات میں تدریس کی ذمہ داری بھی پوری کر چکے تھے، ان کے علاوہ مولانا حبیب الرحمن الٰہ آبادی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا محمد امین پالنپوری اور مولانا عمران ذاکر سنبھلی بھی تھے، کل ۹؍طلبہ کی جماعت تھی، درس میں سب شریک رہتے مگر تمرین فتاویٰ کے لیے تین مفتیان عظام کے حصے میں تقسیم ہو گئے تھے۔

اس وقت حضرت مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری بیمار ہوکر وطن چلے گئے تھے مگر اب تک صدر مفتی کے عہدے پر فائز تھے اور موجود اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، حضرت مفتی نظام الدین اعظمی اور حضرت مفتی احمد علی سعید صاحبان تھے، اب تینوں مفتیان عظام کا انتقال ہو چکا ہے۔ رحمہم اللہ

دارالافتاء کی عمارت میں ہی نصابی کتابوں کا درس ہوتا، البتہ حضرت مفتی محمودؒ کے اسباق ان کے حجرے واقع مسجد چھتہ میں ہوا کرتے تھے، تمرین فتاویٰ کے لیے راقم الحروف حضرت مفتی نظام الدین سے متعلق تھا۔

فقیہ دوراں
حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ شرعی علوم کے مایۂ ناز محقق، فقہ وحدیث کے رمز شناس، تصوف وعلم کلام کے ماہر اور اصلاح وسلوک، رشد وہدایت کی علامت تھے۔

اوائل جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ میں گنگوہ میں پیدا ہوئے، مظاہر علوم اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم سہارن پور سے حدیث کی تکمیل کی، انھوں نے تقریباً ۲۰/سال تک افتاء اور درس وتدریس کی خدمات انجام دیں، پھر تقریباً ۱۴/سال تک جامع العلوم کانپور میں مسند صدارت وافتاء کو رونق بخشی، پھر ۱۳۸۵ھ میں انھیں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے منصب کے لیے منتخب کیا گیا، اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے قریب بخاری شریف جلد ثانی کا درس بھی ان سے متعلق رہا، جو کئی سالوں تک جاری رہا۔

عام طور پر لوگ انھیں مفتی اعظم کے بطور جانتے ہیں اور حقیقتاً اس میدان میں ان کا کوئی شریک ونظیر نہیں تھا، یہ ان کے کمال کا ایک پہلو ہے، ورنہ وہ تمام درسی علوم میں مہارت رکھنے کے ساتھ تاریخ وسیرت اور اکابر واسلاف کے واقعات وحالات پر بڑی وسیع اور عمیق نظر رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، مناظرہ، تصوف، علم جرح وتعدیل کے علاوہ علم عروض کے بھی وہ ماہر تھے،

نہایت ذہین اور حاضر جواب، وہ انتہائی حاضر العلم شخصیت تھے، فقہ اور اصول کے کلیات پر بڑی گہری نظر تھی، ساتھ ہی غیر معمولی قوت استدلال کے مالک، ان کا علم صرف مروّجہ درسی کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ ہر علم وفن کی امہات کتب ان کے مطالعہ میں رہیں اور ان کا استحضار تھا۔

اور فتویٰ نویسی میں تو ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، ان میں حنفیت کے معاملے میں صلابت تھی اور فکر وعقیدے میں کسی طرح کی گمراہی یا بے راہ روی ان کے یہاں برداشت نہیں تھی، چنانچہ انھوں نے بدعت کا بھی مقابلہ کیا اور تجدد پسندی کے خلاف بھی آواز اٹھائی، مبتدعین سے تو کئی بار مناظرے کئے، کانپور میں رہتے ہوئے وہاں کے معروف رضاخانی علماء سے مناظرے کئے اور اخیر میں جھریا (جھارکھنڈ) کا ان کا مناظرہ بھی لوگوں کو یاد ہے۔

انھوں نے درس وتدریس اور افتاء کی راہ میں طویل عرصے خدمات انجام دیں، اصلاح وتصوف کی راہیں بھی طے کیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔

جب ۱۹۷۱ء میں ان سے بخاری شریف جلد ثانی کا درس لیا تو چوں کہ وہ بہت کم کلام کرتے تھے اور بیشتر عبارت خوانی ہوتی، اس لیے ہم طلبہ کو بڑی مایوسی ہوئی، اُدھر حضرت شیخ مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ کا مبسوط اور تفصیلی بیان، حدیث کی تمام جزئیات پر بحث اور یہاں بے انتہا اختصار۔ مگر حقیقت میں ان کے جامع العلوم ہونے کا عقدہ اس وقت کھلا جب ہم ۱۹۷۵ء میں دارالافتاء میں داخل ہوئے، ان سے متعلق دو کتابیں ''الاشباہ والنظائر'' اور ''شرح عقود رسم المفتی'' تھی، درس ہوتا تو کتاب پر بحث مختصر ہوتی، مگر دیگر علوم کے خزانے کھل جاتے، مختصر مختصر انداز میں وہ دیگر علوم پر بحث کرتے یا موجودہ زمانے میں پیش آمدہ مسائل کو فقہ کی روشنی میں حل

کرتے پھر نصوص سے استدلال فرماتے، گرچہ وہ اشارۃً کے انداز میں ہوتا۔ یہ بہر حال طے تھا کہ ان کے درس سے ذہین اور حاضر دماغ طلبہ ہی زیادہ استفادہ کرسکتے تھے۔ دورانِ درس واقعات اکابر سنانے کا مزاج بھی تھا، اپنی زندگی میں علمی مناقشوں اور مناظروں کے احوال بھی سناتے، مزاج میں بیحد نرمی تھی، کسی حد تک مزاح کے انداز میں بھی علمی باتیں بتانے میں وہ یکتا تھے۔

انھوں نے جو فتاویٰ لکھے تھے مرتب طور پر ان کی زندگی میں مکمل تو نہیں ہو سکے، مگر بعد میں وہ ''فتاویٰ محمودیہ'' کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ان کی زندگی کا ایک خاص وصف جس میں وہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں وہ ہے زہد وغنا۔ اللہ نے ان کے حلقۂ علم و ارادت میں صاحب ثروت افراد بھی رکھے تھے جو حضرت کی خدمت میں عقیدت کے بطور نذرانے پیش کرتے مگر حضرت مفتی صاحب وہ تمام رقومات ضرورت مند افراد میں بڑی خاموشی کے ساتھ تقسیم فرما دیتے، ان کے پاس کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں رہتی، دنیاوی آسائش اور ضروریات سے بے رغبتی میں بلاشبہ زہد و قناعت اور سخاوت کے اس معیار پر تھے جہاں اسلاف کی یادیں تازہ ہوتیں۔

اخیر عمر میں انھوں نے مسجد چھتہ میں قیام فرمایا تو وہی ان کی خانقاہ ہوگئی، ارادت مندوں کا ہجوم رہتا اور سب سے بڑی خوبی کی بات یہ کہ ان کے معتقدین ومتوسلین میں بیشتر اہل علم ہی موجود رہے۔

اصلاح وطریقت کی راہ سے بہت سے علماء ان سے بیعت ہوئے اور خلافت بھی حاصل کی جو آج بھی ان کے سلسلۂ علم وسلوک کو ہندوستان اور باہر ممالک میں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔

عرصۂ دراز تک ان کے خادم خاص رہے حضرت مولانا محمد ابراہیم پانڈور

(جنوبی افریقہ) ان کے ممتاز خلفاء میں ہیں، افریقہ میں بھی اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ان کا روحانی فیضان جاری ہے۔

حضرت مفتی اعظم ۹۵/سال کی عمر میں جنوبی افریقہ میں رحلت کر گئے، وہیں ان کا مزار ہے، احقر نے سفر افریقہ کے دوران ان کے مزار پر حاضری دی اور ایصال ثواب کا شرف حاصل کیا۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ

مفتی نظام الدین صاحب ۱۳۲۸ھ میں اپنے وطن موضع اوندرا ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی، پھر مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف اور مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی، اور اپنے پیرو مرشد و مربی کی ایماء پر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، ۱۳۵۲ھ میں دورۂ حدیث کی تعلیم مکمل کی۔

واضح رہے کہ حضرت مفتی نظام الدین ہی کے بقول ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی و سرپرستی مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی فرماتے رہے، انھوں نے ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند بھیجا، پھر تدریس کے لیے مختلف دینی مدارس میں مامور فرمایا، چوں کہ حضرت کے یہاں آمدورفت مستقل تھی اس لیے وقتاً فوقتاً تدریس کے سلسلے میں ہدایات بھی دیتے رہے، ایک وقت وہ بھی آیا جب انھوں نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کو اپنے پاس بلایا اور افتاء نویسی کی تربیت دی، فتویٰ لکھنے کی مشق کرائی، فقہی جزئیات کے لیے کتابوں کی نشاندہی فرمائی اور اس درجہ فائق کردیا کہ وہ کسی بھی دارالافتاء کی ذمہ داری باحسن طریق نبھا سکیں۔ چنانچہ اعظم گڑھ اور گورکھپور کے بعض مدارس میں تدریس کے بعد جب دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں پہنچے تو تدریس کے ساتھ ہی افتاء کے منصب پر فائز ہوئے۔

۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں اربابِ دارالعلوم دیوبند نے ان کی صلاحیت، شہرت اور نیک نامی کی بنیاد پر دارالافتاء میں بطور مفتی خدمت انجام دینے کے لیے طلب کیا تو مشورے کے لیے اپنے مرشد و مربی سے رجوع کیا، انھوں نے حکم دیا کہ وہ دارالعلوم کی یہ ذمہ داری فوراً قبول کریں، چنانچہ وہ دیوبند آئے تو اپنی صلاحیت اور افتاء نویسی کے تجربے کے ساتھ اپنے مرشد کی دعاؤں کا سرمایہ بھی ساتھ لے کر آئے، اور ۲۰۰۰ء (اپنی وفات) تک دارالعلوم دیوبند میں مفتی اور پھر صدر مفتی کی حیثیت سے معروف و مقبول رہے، علمی حلقوں اور خاص طور پر فقہ وفتاویٰ سے متعلق علماء کرام میں مستند مفتی کے طور پر جانے جاتے رہے۔

جب احقر کا داخلہ دارالافتاء میں ہوا اس وقت ان سے قریب ہونے کا زیادہ موقع ملا، سراجی کا درس وہ ہمیں دورۂ حدیث میں پہلے ہی دے چکے تھے، اب دارالافتاء میں بھی دوبارہ السراجیہ فی المیراث کا سبق ان سے متعلق رہا۔ مکمل کتاب اس طرح پڑھائی کہ درسِ نظامی میں علم میراث پر پڑھائی جانے والی یہ تنہا کتاب اب نامانوس نہیں تھی، تمام مباحث بڑی تفصیل کے ساتھ اور مشق و تمرین کے ساتھ مکمل کئے اور ہم طلبہ بھی گویا میراث کے مسائل اور اس کی تقسیم پر پوری طرح قادر ہو چکے تھے۔

حسنِ اتفاق کہ فتویٰ نویسی کی مشق کے لیے بھی مجھے ان کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا، بلاشبہ فقہی جزئیات پر گہری نظر رکھنے والے ہندوستان کے مفتیان کرام میں کوئی ان کے درجے کا نہیں تھا، جامع العلوم والفنون حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ فقہی کلیات اور اصول کے ماہر تھے، اور جامع فتویٰ نویسی کا فن حضرت مفتی احمد علی سعید کا ہنر تھا، مگر ایک تحقیق کرنے والے اور زیادہ سے زیادہ تفصیل سے جزئیات حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے حضرت مفتی نظام الدین صاحب اللہ کی

نعمت تھے، البتہ فتاویٰ لکھنے میں وہ تفصیل کو پسند کرتے تھے۔

عصر حاضر میں پیش آنے والے مسائل پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر تھی اور بہت سے مسائل پر انھوں نے مفصل اور مدلل جوابات لکھے ہیں، جن کا مجموعہ ''منتخب نظام الفتاویٰ'' کے نام سے حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی قاضی القضاۃ امارت شرعیہ پٹنہ نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

ان کے بعض فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان رسالہ ''دارالعلوم'' میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں، اور ان کے تحریر کردہ جوابات میں سے ''نظام الفتاویٰ'' کے نام سے دو حصے شائع بھی ہو چکے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی شخصیت ایک باوقار سنجیدہ، متقی اور عالمانہ تھی، وہ نیک سیرت، نیک فطرت، متین و بردبار اور کم گو تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے فقہ وفتاویٰ کی مشغولیت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور تحشیہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، ان کی کئی کتابیں طبع ہوئیں، مگر خاص طور پر ان کا علمی اور فقہی کارنامہ معروف کتاب ''فتح الرحمن فی مواہب النعمان'' کی اشاعت ہے، جس کو انھوں نے اپنے حاشیے کے ساتھ بہترین انداز میں شائع کرایا۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنا وطن مالوف چھوڑا اور دیوبند میں مقیم ہو گئے، ان کی اولاد بھی یہیں رہی، تین نرینہ اولاد قیام الدین، حسام الدین اور اسلام الدین اپنے والد کی طرح شریف الطبع ہیں۔

۲۶ رفروری ۲۰۰۰ء کو دیوبند میں وفات پائی، مزار قاسمی میں اکابر دیوبند کے ساتھ مدفون ہیں۔ **تغمده الله بغفرانه**

حضرت مفتی احمد علی سعید صاحبؒ

راقم الحروف جس وقت دارالعلوم دیوبند میں داخل درس تھا، اہتمام کی مسند کو رونق و زینت بخشنے والی شخصیت تھی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کی، اوران کے نائب تھے بجنور کے رہنے والے عالم دین اور عارف باللہ حضرت مولانا مبارک علی نوراللہ مرقدہٗ، ولی صفت بزرگ ومتقی، حدیث شریف کادرس بھی ان سے متعلق تھا، بارہاان کی زیارت ہوئی تھی، خاموش طبع مگرعلم وتقویٰ اور روحانیت ان کی شخصیت سے عیاں۔ ان کے ہی لائق فرزند تھے حضرت مفتی احمد علی سعید رحمۃ اللہ علیہ، اوران سے تعلق بھی طالب علمانہ ہوا ۱۹۷۵ء میں جب دارالافتاء میں ان سے متعلق کتاب ہوئی درمختار۔ گرچہ ان کی ایک اہم تصنیف ’’عورت اوراسلام‘‘ ۱۹۵۴ء ہی میں طبع ہوئی تھی اوراسلام میں عورت کامقام، اس کے حقوق اور ذمہ داریوں سے متعلق یہ کتاب اس زمانے میں اہم ترین اور بے مثال تھی۔ اس کے بعدتو دیگر علماء نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ سپرد قلم کیاہے، اس کےعلاوہ ان کے فتاویٰ پر مشتمل ’’فتاویٰ سعیدیہ‘‘ کے چند حصے بھی شائع ہوچکے تھے، اس لیے ان کی علمی صلاحیت اورفتویٰ نویسی کی خوبیوں سے ایک گونہ واقفیت تھی۔ ان سے سال بھرتک استفادہ کیااور گوکہ تمرین فتاویٰ ان سے متعلق نہیں تھی اس کے باوجودان کی تحریریں جواستفتاء کے جواب میں ہوتیں وہ ضرور پڑھا کرتا تھا، کیوں کہ فتاویٰ کومختصر انداز میں تحریر کرنے میں ان کوملکہ تھا۔

تقریباً ۶۰/سال تک انھوں نے افتاء کی خدمت انجام دی ہے، ابتداء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد علوم عصریہ سے متعلق عصری درسگاہوں میں امتحانات دے کر کامیابی حاصل کی، حضرت مفتی محمد سہول بھاگلپوری کی ہدایت پر انھوں نے دارالافتاء میں حاضری دے کر ان سے فتویٰ نویسی کی مشق کی، اسی دوران امرتسر ایم او کالج میں عربی لیکچرار کے بطور تقرر رہوا، مگر مفتی سہول صاحب نے ان کو روک دیا اور خود دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں ان کی تقرری کی راہ ہموار کردی، نائب مفتی کے بطور تقرر رہوا، پھر مفتی کے منصب کو سنبھالا، دارالعلوم وقف دیوبند میں وہ مفتی اعظم کے بطور اخیر عمر تک درس وتدریس اور افتاءنویسی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اپنی تصنیف ''عورت اور اسلام'' میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء تک ان کے فتاویٰ کی تعداد تین لاکھ سے زائد تھی اور تین سو سے زائد شرعی پنچایت اور دارالقضاء سے شرعی فیصلے کئے جاچکے تھے۔ اس کے بعد بھی وہ ۱۸/سال تک حیات رہے اور دارالافتاء و دارالقضاء سے فتاویٰ اور فیصلے جاری رہے، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا تعداد ہوگئی ہوگی۔

۱۹۸۲ء دارالعلوم دیوبند میں خلفشار، انتشار اور انقلاب کا سال، ایک گروپ نے دارالعلوم کی عمارات پر قبضہ کرلیا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ۸۵/ہمنوا بے دخل ہوئے، دارالعلوم کے مسلک اور روایات کا تحفظ بھی مسئلہ تھا اور عمارتوں کو غیر شرعی وغیر آئینی قبضے سے واگذاری کا بھی، اس لیے ایک مجلس بنی ''مجلس تحفظ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے، جس کے ذمہ دار اعلیٰ تھے حضرت مفتی احمد علی سعید۔ اور جب قابض گروپ نے عدالت میں دارالعلوم دیوبند کے وقف اور مذہبی ادارہ ہونے کا انکار کردیا تو مخلصین دارالعلوم نے ادارے کی تعلیمی و انتظامی سرگرمی جاری رکھنے کے لیے ''وقف دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے تمام سابقہ

سرگرمیاں دیوبند میں شروع کردیں، اس تحریک کے روح رواں بلاشبہ حضرت مفتی صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری علیہ الرحمہ تھے، جن کی کوششوں سے تعلیم کی ابتدا حضرت حکیم الاسلام کے درس سے ہوگئی۔

اس کے بعد مقدمات کی پیروی اور انتظامی کارروائیاں بے سروسامانی اور کسمپرسی کے حالات میں حضرت مفتی صاحب کی رہین منت ہیں۔

دارالعلوم وقف دیوبند دس سال کے بعد اپنی عمارتوں میں پہنچا، حالات بہتر ہوئے، درس وتدریس کی مقبولیت ہوئی، اوراب بحمد اللہ تقریباً آٹھ سوطلبہ دورۂ حدیث سے ہر سال فراغت حاصل کرتے ہیں۔

دارالافتاء کی تمام تر سرگرمیاں (افتاء نویسی، طلبہ کی تمرین وتربیت) حضرت مفتی صاحب کی نگرانی میں جاری رہیں اور عام مسلمانوں کا رجوع بھی بیحد بڑھتا گیا، حضرت مفتی صاحب کی عند اللہ مقبولیت کی ایک نشانی ہے کہ ۱۹۹۸ء میں رمضان کی ۲۷/ویں شب کو ان کا انتقال ہوا اور مزار قاسمی میں تدفین ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مفتی صاحب کو حالات حاضرہ کے مسائل پر بھی بڑا ادرک تھا اور کسی مسئلے میں اپنی رائے کے لیے وہ اتنی نقلی و عقلی دلیلیں پیش کردیتے کہ ان سے اختلاف کرنے والوں کو بھی خاموشی اختیار کرنی پڑتی۔

حضرت مفتی احمد علی سعید رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں بھی تھیں، مگر عالمانہ وقار کے ساتھ اور ان کا خاص وصف تھا جرأت و بیباکی۔ نہ ان میں منافقت تھی اور نہ مداہنت، اپنے معاصرین یا خوردوں سے اگر کسی بات پر ناراض ہوئے تو اس سے زیادہ جلدی انھیں معاف بھی کردیا، اور یہ تو طے تھا کہ اپنے دل میں کبھی کسی کے خلاف نفرت، غصہ یا جذبۂ انتقام رکھنے پر قدرتی طور پر قادر ہی نہیں

تھے۔ان کا ظاہر و باطن یکساں رہا، نرم خوئی اور نرم گوئی ان کی پہچان تھی۔
ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، ان کا نواسہ ''بدر عالم'' دارالعلوم وقف سے وابستہ ہے اور روحانی علاج کے لیے عوامی خدمت میں مصروف۔

خصوصی استفادہ

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

درسی تعلق

ترجمان مسلک دیوبند، جانشین علوم قاسمی و معارفِ انوری، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت کے حامل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ کا نام بحیثیت مہتمم دارالعلوم دیوبند مجھ جیسے مبتدی طالب علم کے دل و دماغ میں مانوس تھا، جب پہلی بار احاطۂ دارالعلوم میں حضرت کی زیارت ہوئی تو ذہن میں مرتسم نقش و نگار کے مطابق ہی پایا، قد و قامت نہایت متوازن، نورانی چہرہ، خوبصورت رنگ، ہلکا بدن، متانت، سنجیدگی، علم و حلم، تقویٰ وطہارت تمام اثرات شخصیت کا جزو، پھر بارہا حضرت کے خطاب سے بہرہ ور ہوا، پہلے متأثر پھر معتقد ہوا۔

۱۹۶۸ء میں حضرت سے متعلق باضابطہ درس کے لیے کوئی کتاب متعین نہیں

تھی، اس سے پہلے وہ بارہا مشکوٰۃ کا درس دیتے رہے ہیں، بخاری کی ابتدا بھی فرمائی ہے، مگر ایک کتاب جو خارج میں ان سے متعلق تھی وہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' تھی، اس میں منتہی درجات کے طلبہ شریک ہوتے، چنانچہ ہمیں دورۂ حدیث کے سال میں درس میں پہلی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، دارالعلوم دیوبند کی قدیم مسجد میں درس ہوتا، جس طرح الامام المحدث الشیخ ولی اللہ دہلوی کی یہ مایۂ ناز تصنیف، اسی طرح یہ باکمال شارح ومدرّس، بارہادرس میں حاضری ہوئی ہے۔

اسی سال حدیث المسلسلات کا درس بھی دیا جس میں ہم دورۂ حدیث کے طلبہ شریک ہوئے اوران کے خصوصی خطاب وتدریس سے مستفید ہوئے۔

حضرت حکیم الاسلام سے درس کا صرف اتنا ہی تعلق رہا ہے، مگر وہ علمی نکات، وہ انداز تدریس آج بھی ہمارے ذہنوں میں منقش ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام کے تعلق سے راقم الحروف نے اردو اور عربی میں بیسیوں مضامین لکھے جو شائع ہو چکے ہیں، بحمد اللہ ایک مستقل کتاب بھی ترتیب دی ہے، جس کا عنوان ہے ''دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلامؒ'' یہاں صرف ایک مضمون شامل اشاعت کررہا ہوں، ورنہ ان کی شخصیت، خدمات، خصوصیات اور کارناموں پر مشتمل احقر کی مذکورہ کتاب کسی حد تک کافی ہے۔

عربی زبان میں ان کی رحلت پر مضامین کئی لکھے، مگر صرف ان کی شخصیت سے متعلق میری اپنی کاوش عربی رسالہ ''الثقافۃ'' کا وہ خصوصی نمبر ہے جو ان کے نام ہی سے منسوب ہے۔

دارالعلوم پر ایک گروپ کے قبضے کے بعد جب دارالعلوم کے اساتذہ وکارکنان پر مشتمل ۸۵ ر افراد حضرت کے ساتھ رہ کر دارالعلوم وقف میں شامل ہوئے تو احقر بھی ان کے ساتھ تھا، چوں کہ راقم کو عربی زبان وادب سے دلچسپی تھی

اور عربی صحافت سے وابستگی رہ چکی تھی، اس لیے تمام تر پریشانیوں اور بے سروسامانی کے باوجود میں نے ایک عربی ماہنامہ "الثقـــافة" کا اجراء کیا جو بحمد اللہ اس حالت میں دو سال تک مسلسل جاری رہا کہ دیو بند میں آفسیٹ پریس بھی نہیں تھا اور کمپیوٹر تو بعد کی چیز تھی، اکیلا اس کی ساری ذمہ داریاں نبھاتا رہا اور کسب معاش کے لیے بھی وقت فارغ کرتا رہا۔ ۱۹۸۳ء جولائی میں جس وقت حضرت حکیم الاسلام کا انتقال ہوا، میں نے ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جو معمول سے کئی گنا ضخیم تھا، عالم اسلام کے معروف اسکالروں کے مضامین بھی اس میں شامل تھے اور بعض اردو کے مضامین کا میں نے عربی ترجمہ بھی کیا۔

اب حضرت سے متعلق میرا ایک شائع شدہ کسی حد تک جامع مضمون پیش خدمت ہے:

دارالعلوم دیوبند

اور

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ

مغلیہ عہد حکومت کا زوال

اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد متحدہ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوتا ہے، اقتدار کے لئے رسّہ کشی، مختلف طبقوں کی بغاوتیں اور سازشیں، ایک بغاوت ختم ہوتی تو دوسری جگہ سے بغاوت کی خبر آنے لگتی، راجپوتوں اور سکھوں نے بغاوت کی تو مسلم امراء میں بھی تفرقہ شروع ہوا، دوفریق نمایاں تھے ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے تو اسلامی حکومت کی جڑیں ہلا دیں، پھر یکے بعد دیگرے حکمراں آتے رہے اور ہندوستان کے علاقے ان کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ اورنگزیب کے پوتے فرخ سیر کے زمانے میں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی راہداری کا پروانہ مل چکا تھا، پھر ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا اور بنگال کمپنی (انگریز) کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ادھر مرہٹوں نے

''شاہ گری'' کا کام شروع کردیا، ایک معزول کیا تو دوسرے کوتخت نشین، اور اُدھر انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت ختم کرکے دہلی پر اپنے آلۂ کار حکمرانوں کو بٹھادیا، بالآخر ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۷ء تک بادشاہ سلامت مغل خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور وہ دہلی میں محدود تخت نشیں ہیں۔

پھر شروع ہوتا ہے بغاوت ۱۸۵۷ء کا دور، ہندوستانی باشندوں کا اپنے ملک سے غیر ملکی طاقت (انگریز) کو ہٹانے کا عزم اور اسکے لئے حکمراں انگریز کے خلاف بغاوت کا سلسلہ، جس میں مسلح منظّم اور طاقتور انگریزی حکمرانوں کے مقابلے برصغیر کے مسلم، ہندو اور دوسری قوموں کی غیر منظّم، کمزور اور ناکام کوشش، اور منطقی انجام بغاوت کی ناکامی اور اس کو نام دیا گیا غدر کا، بادشاہ سلامت کو جلاوطنی کی سزا، شہزادوں کا قتل، اور اس بغاوت کے رہنماؤں کا قتل عام، لوٹ مار، خوں ریزی اور پبلک مقامات پر پھانسیاں۔

اس ناکام بغاوت کے بعد جن افراد پر تحریک غدر میں شامل ہونے کا شبہ ہوا یا مخبری کی گئی ان میں بیشتر کو پھانسی دے دی گئی یا روپوش ہوگئے، ان لوگوں میں وہ علماء مشائخ بھی تھے جو مغربی یوپی میں مسلمانوں کی قیادت کررہے تھے، میرٹھ، سہارنپور، تھانہ بھون، بلند شہر اور علی گڑھ کے مجاہدین اور علماء حق۔

تحریک آزادئ ہند

ملک کی جدوجہد آزادی کی یہ پہلی تحریک تھی جس کی ابتدا میرٹھ سے ہوئی اور بلاشبہ جس کے قائدین میں جنرل بخت جیسے عالی ہمت افراد کے علاوہ علماء دین بھی تھے جن کا تعلق شمال کے اسی خطے سے تھا، اور گو کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم ہندوستانیوں نے بھی ساتھ دیا اور ناکامی کی صورت میں ان کا قتل عام ہوا مگر حقیقت میں انگریز حکمرانوں نے یہ باور کرلیا تھا کہ یہ اسلامی جہاد ہے اور

مسلمان ہی اس کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، اسلئے اس قتل عام اور انتقامی جنون کے شکار سب سے زیادہ مسلمان ہی ہوئے، دہلی اور اطراف، خاص طور پر ضلع میرٹھ، مظفرنگر اور سہارنپور کے مسلمان اور علماء دین۔

اس تحریکِ بغاوت کو تقویت دینے اور عملی طور پر اس میں حصہ لینے والوں میں علماء کی ایک جماعت نمایاں تھی جس کے سربراہ اور امیر حاجی امداد اللہ تھانوی (مہاجر مکی) تھے اور ان کے دست راست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ محمد تھانوی، حضرت حافظ ضامن شہید وغیرہ تھے، جنھوں نے معرکۂ شاملی وتھانہ بھون میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی ۱۸۵۷ء کی یہ بغاوت ناکام ہوگئی تو اس جماعت علماء کو بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، حافظ ضامن نے جام شہادت نوش کیا، حضرت گنگوہی جیل گئے، حضرت نانوتوی روپوش ہوئے اور امیر کارواں مکہ معظّمہ ہجرت کرگئے۔

غرض کہ اس جہاد حریت اور انقلابی کوشش کی قیمت سب سے زیادہ مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی اور انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے یہ سمجھا کہ مسلمان ہی اس بغاوت کے ذمہ دار ہیں، اسلئے ان کی آئندہ نسلوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اور جب دسمبر ۵۷ء کے اخیر تک انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت پر اپنا تسلط قائم کرلیا اور اپنی انتقامی کارروائیوں اور خوں ریزیوں سے تمام ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو شکست ومایوسی کے غار میں دھکیل دیا تب برصغیر ہند پر اپنی حکومت کی بالادستی قائم کرنے اور طویل عرصے تک یہاں رہنے کیلئے منصوبہ بندی شروع کی، سب سے پہلے تعلیم پر انگریزوں کی پالیسی شروع ہوئی جو یہ تھی:

۱- عام طور پر لوگوں کو ناخواندہ رکھا جائے۔ ۲- مسلمانوں کو عیسائی بنایا جائے۔ ۳- ہندوستانیوں کو لامذہب بنایا جائے۔ پہلی دو پالیسیوں پر یکے بعد دیگرے عمل ہوتا

رہا مگر وہ نا کام رہیں، گرچہ ان سے بھی باشندگان ہند کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، مگر اب وہ پالیسی نافذ کی جانے لگی جس سے اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی ثقافتی ودینی شناخت ختم ہوسکے، یہاں ''لارڈ میکالے'' کی رائے اور منصوبہ بھی پیش نظر رہے:

> ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون ورنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق اور فہم کے لحاظ سے انگریز ہو۔''

اس پالیسی کا حاصل یہ تھا کہ برطانوی شہنشاہیت کے وفادار غلام پیدا کیے جائیں اور مسلمانوں کو ان کے دین و مذہب سے لاتعلق کر دیا جائے۔

اسی دوران انگریزوں نے عیسائی پادریوں کی مدد سے پورے ہندوستان میں انگریزی جھنڈا لہرانے اور عیسائیت کے غلبے کی مہم جاری رکھی۔ مسلمان شکست خوردہ تھے، سیاست کے نام پر تحریک ان کے لیے ناممکن، قوم میں تنظیم ہی نہیں رہ گئی تھی، ایسی صورت میں اسلام کی بقاء، علوم دین کی حفاظت اور مسلمانوں کے تحفظ کی کیا صورت ہو؟

دارالعلوم دیوبند کا قیام

انگریز حکمرانوں کی تعلیمی پالیسی کے علی الرغم چند نفوس قدسیہ نے طے کیا کہ مذہب اور دین کی بقا کیلئے تعلیم کی راہ اپنائی جائے اور خالص غیر حکومتی دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ پھر خاندان ولی اللہ دہلوی کے جانشینوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے روحانی فیض یافتہ برگزیدہ اشخاص نے بتوکل علی اللہ دیوبند میں ایک ''عربی مدرسہ'' کی بنیاد ڈالدی اور اسی طرز پر سہارنپور، مرادآباد اور دیگر مقامات پر مدارس کی ابتدا ہوگئی جن کا نعرہ تھا:

> ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔''

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء اکابر علماء نے جس عربی مدرسے کی بنیاد رکھی وہ اس علمی تحریک کا آغاز تھا جسے دیوبند کی علمی تحریک سے معنون کیا جاتا ہے، اور جس نے اسلامیانِ ہند کو اپنے دین، عقیدہ و ایمان اور اسلامی وجود کے تحفظ کے لیے ایک نئی جہت عطا کی، پھر ملک کے مختلف علاقوں میں اس طرح کے دینی مدارس کے قیام کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو نہ صرف کتاب وسنت اور علوم اسلامیہ کی تدریس کے مراکز بنے، بلکہ ملک کی جدوجہد آزادی کی بنیاد بھی بنے۔

دیوبند کا یہ ''عربی مدرسہ'' دارالعلوم دیوبند بنا اور ان نفوس قدسیہ کے اخلاص ومحنت کو اللہ نے غیر معمولی قبولیت سے نوازا، ادارہ ترقی کرتا رہا، طالبان علوم دینیہ کا رجوع بڑھتا گیا، رفتہ رفتہ اس علمی و دینی مرکز سے دین کی ہمہ جہت خدمات کیلئے ایسے افراد تیار ہوئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے زرّیں ابواب ہیں، حلقۂ دیوبند کی فخر روزگار اور اساطین علم وفضل شخصیتوں کی تعداد اور ان کی خدمات کا ذکر ہزاروں صفحات بھی یکجا نہیں کرسکتے، یہاں صرف ایک ایسی شخصیت کا سرسری تذکرہ مقصود ہے جو جامع الصفات اور مختلف النوع صلاحیتوں کی مالک ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے علمی ونسبی جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند، جنھوں نے اس عربی مدرسہ دارالعلوم کو ''الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' کے عالی مقام تک پہونچادیا، دیوبند کی اس علمی تحریک کو ملک گیر، پھر عالمگیر بنادیا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

حضرت مولانا محمد طیب رحمہ اللہ، نانوتوی خاندان کے علمی ودینی ماحول میں ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء پیدا ہوئے، تاریخی نام ''مظفرالدین'' قرار پایا، ان کے

والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کو قاری صاحب کی ولادت سے دو سال قبل ہی فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (سرپرست دارالعلوم دیوبند) نے دارالعلوم کے اہتمام کے لیے منتخب فرمایا تھا، تعلیم وتربیت کے لئے خالص دینی وعلمی ماحول میسر آیا، سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کئے گئے، دو سال میں حفظ قرآن اور قرأت وتجوید سے فراغت ہوگئی، پھر فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم مکمل کر کے عربی درجات میں داخل ہوئے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے دارالعلوم کے اساتذہ نے تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند میں ''تحریک ریشمی رومال'' کے سربراہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ آزادیٔ وطن کے لئے قیادت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے، ان کی تعلیم وتربیت کے زیرسایہ حضرت مولانا محمد طیبؒ پروان چڑھے، اور حدیث کا علم علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ سے حاصل کیا، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور والد محترم مولانا حافظ محمد احمدؒ سے بھی تعلیم پائی، ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۸ء) میں دارالعلوم سے فراغت پائی اور اعزازی طور پر دارالعلوم میں تدریس سے وابستہ ہوگئے، ارادت و عقیدت کا تعلق حضرت شیخ الہند، علامہ کشمیریؒ اور پھر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے قائم کیا، ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ اہتمام میں ہی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی تجویز وتائید سے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے نظم ونسق کی نگرانی کے لیے نائب مہتمم بنائے گئے، چند سالوں میں انتظام و انصرام اور دارالعلوم کے شعبہ جات کے جملہ امور سے واقفیت ہوگئی اور مہتمم اعلیٰ حضرت عثمانی

رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو باتفاق مجلس شوریٰ و اکابر علماء دیوبند مستقل طور پر مہتمم بنائے گئے، اور اخیر عمر تک اس عہدے پر فائز رہے، اہتمام کو ایک نئی جہت دی اور دارالعلوم دیوبند کو عالمی سطح پر متعارف کرایا، اس طرح کہ دارالعلوم دیوبند اور حضرت حکیم الاسلام ایک دوسرے کے جز بن گئے، دارالعلوم کے ذکر کے ساتھ حضرت قاری طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا تصور ابھرتا اور حضرت مہتمم صاحب کے لقب سے دارالعلوم کا ذکر واضح ہوتا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمۃ کی نیابت اہتمام کے دور سے ان کی رحلت تک ساٹھ سال کا ایک طویل عرصہ ہے جس میں دارالعلوم کی مکمل قیادت اور مسلمانان ہند کے اس دینی، تعلیمی اور تبلیغی مرکز کی تعمیر وترقی کا کام نہایت عروج پر پہنچا دیا، جس کا اعتراف ایک تاریخی حقیقت ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی، آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، حکمراں طبقہ ہر اس تنظیم اور ادارے نیز شخصیات کی قبولیت ومرجعیت ختم کردینے کے درپئے تھا جس سے مخالفت ہوتی یا جس سے اقتدار اور تسلط کو خطرہ ہوسکتا تھا، اور دارالعلوم دیوبند کو بجا طور پر مسلمانوں کے دینی وروحانی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اس لئے بارہا اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس کے نظم ونسق میں کسی طور پر مداخلت کی کوئی صورت بن سکے مگر حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دانشمندی، حکمت وتدبر سے دارالعلوم کو اس طرح محفوظ رکھا کہ اس میں سیاسی مداخلت نہ ہوسکے، تعلیم وتبلیغ اور اشاعت، علوم قرآن وحدیث کی خدمت یکسوئی کے ساتھ جاری رہی، پھر دارالعلوم کو حکومت کی طرف سے مالی امداد وتعاون کی پیش کش کی گئی، مگر بانیٔ دارالعلوم کے الہامی اصولوں پر پابندی اور حضرت مہتمم صاحب کی حکیمانہ قیادت کا اثر تھا کہ اس طرح کے تمام راستے مسدود کردیے گئے، جس سے ادارے کی آزادی و

خودمختاری کو کوئی خطرہ پیش آسکتا تھا، ہندوستانی مسلمان اپنے تعاون اور مالی امداد سے ادارے کی خدمت کرتے رہے، مگر جب وطن کو آزادی ملی اور ملک کے دو حصے ہو گئے اس وقت دارالعلوم دیوبند کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بڑے بڑے اصحاب ثروت معاونین پاکستان چلے گئے اور دارالعلوم سے وابستہ بہت سے ماہر اساتذہ و شیوخ بھی ہندوستان چھوڑ گئے، اس صبر آزما دور اور مشکل حالات میں بھی حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم دیوبند کے کردار اور خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دی، اس کی تعمیر و ترقی اور اس کی توسیع کے لیے ہر ہر طرح سے کوشش کی اور خدا کا فضل اس طرح شامل رہا کہ دارالعلوم مزید ترقی کرتا گیا، دارالعلوم دیوبند کی تعمیر و ترقی، اس کی خدمات کا تعارف اور مسلک اکابر دیوبند کی ترجمانی کے لیے حضرت حکیم الاسلام کے اسفار اور تقریری پروگرام، ملک و بیرون ملک تبلیغی و دعوتی دورے اس ساٹھ سالہ دورِ اہتمام کی ایک عظیم الشان خصوصیت ہے۔

دیوبند میں قیام کے دوران حضرت رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے تمام شعبہ جات کی کارکردگی پر نظر رکھتے، اس کی توسیعی خدمات کے لئے جدوجہد فرماتے اور جب دیوبند سے باہر سفر پر ہوتے تو دارالعلوم کے دیگر مقاصد کی تکمیل فرماتے جس میں تبلیغ و دعوت اور اصلاح معاشرہ کے اعلیٰ مقاصد بھی شامل تھے، حضرت کے ملکی و غیر ملکی اسفار ایک ایسا عنوان ہے جس پر تفصیلی بحث کا مطلب ہے ایسی تاریخ مرتب کرنا جو برصغیر کے علاوہ پورے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک کے سیکڑوں اسفار، تقاریر اور اجتماعات میں شرکت پر مشتمل ہو جو دراصل دارالعلوم کے نصب العین اور مسلک دیوبند کے تعارف اور علماء دیوبند کی سرگرمیوں کی اشاعت کے ذریعے تھے۔

وہ دینی تحریک جو دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے شروع ہوئی اور ”مسلک دیوبند“

سے متعارف ہوئی جس کا مقصد احیاء علوم دین، بقائے عقائد اسلامی اور اشاعتِ علوم قرآنی تھا، وہ کسی خاص علاقہ، ملک یا جماعت تک منحصر نہیں تھا، یہ تحریک حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذریعہ عالمگیر بن گئی، اور یہ ادارہ بین الاقوامی دینی مرکز کی حیثیت سے معروف ومستند ہوا اور اس مسلکِ دیوبند کے ترجمان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے قائد کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی، اور اس کی وجہ حضرت کا حسنِ نیت، اخلاصِ عمل، عبقری صلاحیت، تقریر وتحریر کی نادر مہارت اور ان کی شخصی خوبیاں ہیں، اس وجہ سے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں میں دینی رہنما وقائد کی حیثیت سے ان کی شخصیت سب سے ممتاز اور نمایاں رہی ہے، اور پورے برصغیر میں امت کے مرجع بنے رہے۔

اس لئے جب ہندوستان میں بلاتفریق مسلک تمام مسلمانان ہند کی تنظیم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا تو متفقہ طور پر ان کو صدر منتخب کیا گیا اور اخیر عمر تک اس منصب کو اپنی صلاحیتوں سے زینت بخشی، تمام جماعتوں، مسالک اور تنظیموں کے علماء وسربراہان ان کی قیادت سے مطمئن رہے۔

ان تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا خود ایک عظیم کارنامہ ہے جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات سے منسوب ہے، بیحد مشغولیات اور اسفار کی کثرت کے باوجود ایک نمایاں وصف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف وتالیف اور مقالات ومضامین لکھنا بھی ہے، سفر یا حضر کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ بہت سے مضامین اور مقالے دوران سفر ہی انجام پاتے، دوران سفر ٹرین میں بیٹھ کر کسی مضمون کو مکمل کر لینا تو ان کی انفرادیت رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اتنی مصروفیات، تقریری پروگرام اور اسفار کے باوجود مختصر اور طویل مضامین کے علاوہ کتابوں کی تالیف انکا عظیم الشان کارنامہ ہے، اور ان تصنیفات میں اسرار دین اور حکمت پر قرآن وحدیث سے

دلائل اس طرح موجود ہیں کہ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، محدث زماں علامہ انور شاہ کشمیری اور مجدد ملت حضرت تھانوی علیہم الرحمہ کے علوم کے جامع اور ان کے روحانی جانشین تھے۔

ان کے مضامین اور تصانیف کے علاوہ ان کی تقریروں پر مشتمل مجموعہ ''خطبات حکیم الاسلام'' دس جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جو دین وشریعت کے مختلف عنوانات پر دعوت وتبلیغ، موعظت وحکمت اور اصلاح معاشرہ کے لئے ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، علماء دین، طلبۂ مدارس اسلامیہ اور عام مسلمانوں کے لیے ایک ذخیرہ بیش بہا ہے۔

علوم اکابر دیوبند اور مسلک دیوبند کے ترجمان حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶ ؍شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ ؍جولائی ۱۹۸۳ء دیوبند میں ہوئی اور مزار قاسمی میں مدفون ہوئے۔ **تغمّدہ اللہ بغفرانہ**

محدث، فقیہ، مؤرخ

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ حلبی رحمہ اللہ

پہلی ملاقات

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد تکمیل ادب عربی کے شعبے میں داخل ہوا اور ''النادی الادبی'' کے ذریعہ عربی زبان وادب کا شعور حاصل ہوا، عربی سے دلچسپی کی بنا پر عربی اخبارات ورسائل کا مطالعہ بھی معمول سا بن گیا، جس کی وجہ سے عرب دنیا خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں نامور علماء دین اور عربی زبان وادب کے ارتقا اور عرب دنیا کے جغرافیہ سے بھی ایک گونہ آشنائی ہوئی، عرب ممالک میں قائم جامعات اور معاہد کے تذکرے سامنے آئے، جامعہ ازہر کے علاوہ مصر کی دوسری اعلیٰ درسگاہوں اور سعودی عرب میں نئے نئے قائم جامعات کے بارے میں تجسس پیدا ہوا، حالات بھی معلوم ہوتے رہے، ملک شام کے دمشق اور حلب کی یونیورسٹیوں اور وہاں کے بعض ماہرین فن ورجال کے نام سنے، اسی زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس پر مامور ڈاکٹر عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعالی العقباوی کے نام سامنے آئے، گوکہ یہ دونوں حضرات واپس مصر جا چکے تھے، پھر ایک بار شیخ الازہر جناب عبدالحلیم محمود اور قاری عبدالباسط مصر سے دیوبند تشریف لائے، دارالحدیث تحتانی میں ان کا پروگرام ہوا تو سب سے پہلے کسی عرب عالم یا معروفِ عالَم قاری باسط (عبدالباسط) کی زیارت ہوئی تھی۔

پھر جب ۱۹۷۶ء میں پندرہ روزہ اخبار ''الداعی'' سے منسلک ہوا تو عربی زبان وادب، عرب دنیا اور علماء سے تعلق اور رابطہ بڑھا، اسی دوران ایک عبقری عالم دین، محدث وفقیہ علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا نام بھی سنا اور ان کی بعض تحریریں پڑھنے کا موقع ملا، اور دل میں ان کے لیے عقیدت کے جذبات پیدا ہوئے، اجلاس صدسالہ کے لیے تیاریاں شروع ہوچکی تھیں، ایک دن ''الداعی'' کے مدیر اعلیٰ اور میرے رفیق درس حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی نے کہا کہ ایک عرب عالم دین دیوبند میں تشریف لائے ہیں، چلو ان سے ملاقات کریں، اس زمانے میں کوئی عرب شیخ دیوبند آتے تو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق رہتا، تمنا یہ ہوتی کہ ملاقات ہوگی، گفتگو ہوگی تو کچھ عربی سیکھنے کا موقع بھی میسر آئے گا، پھر جب مولانا بدرالحسن نے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا نام لیا تو فوراً مہمان خانہ کے لیے چل پڑا، عقیدت پہلے سے تھی اور اب خود حضرت جلوہ افروز ہوئے تھے تو اپنی خوشی اور خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ؟ شیخ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

شخصیت اور کارنامے

عالم اسلام کی نامور شخصیت، محدّث وفقیہ، محقق ومصنّف شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ ملک شام (Syria) کے تاریخی شہر ''حلب'' میں ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے شہر اور ملک میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے ''جامعہ ازہر'' مصر میں داخل ہوئے، وہاں اس وقت کے مشائخ عظام سے کسب علم کیا، مگر زیادہ علمی استفادہ اپنے خصوصی استاذ علامہ زاہد بن الحسن الکوثری سے کیا، اور ان کے ہی علم اور تحقیقی رنگ کو اپنایا، اسی لیے عام طور پر ہم بلادِ ہند میں بھی انھیں تلمیذ الکوثری کے لقب سے زیادہ جانتے ہیں۔

ان کا فقہی مسلک حنفی تھا مگر تمام ائمہ کرام کے لیے یکساں احترام وعقیدت

ان کی تحریروں اور کتابوں میں نمایاں ہے، ان کی نظر فقہ پر غائرانہ تھی اور علم حدیث پر بھی کمال حاصل تھا، محدثین اور فقہاء کے مابین پیدا کردہ دوری کو بھی انھوں نے بڑے علمی اسلوب میں دور کرنے کی کوشش کی ہے، فقہ حنفی میں ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا اور تمام فقہائے امت کے مذاہب پر ان کی وسیع نظر تھی۔

مصر میں قیام کے دوران ہی ان کی ملاقات ''الاخوان المسلمون'' کے بانی شیخ حسن البنا رحمہ اللہ سے ہوئی اور ان کی اصلاحی تحریک سے وابستہ رہے، وہ اخوان المسلمین کے مراقبِ عام بھی رہے، جس کے لیے انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے دو چار ہونا پڑا مگر چوں کہ ان کا مزاج علمی تھا، اس لیے وہ تحریکات میں سرگرم ہونے کی بجائے تعلیم و تعلّم اور تحقیق و تصنیف ہی میں مشغول رہے، وہ واپس اپنے ملک آئے مگر وہاں سے جلاوطن ہوئے اور اپنی عمر کے بیس سال سعودی عرب میں گذارے، پہلے جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) میں ایک مقبول و باکمال استاذ کی حیثیت سے رہے، ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف بھی جاری رہی، مگر شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کو عظیم انسان کی طرح مخالفتوں اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ راقم الحروف نے خود ان سے بعض واقعات سنے ہیں، مگر شیخ کی علمی حیثیت اور شخصیت تمام مخالفین پر غالب رہی، چوں کہ وہ خود حنفی المسلک تھے اور نامور شیخ زاہد الکوثری کے شاگرد و جانشین تھے، اس لیے ایک طبقے نے (خاص طور پر غیر مقلدین بنام سلفیوں نے) ان کے خلاف سعودی عرب میں مورچہ کھول دیا تھا، شیخ نے جواب تو دیا مگر علمی انداز میں اور شائستہ اسلوب میں، ان مخالفتوں کا حال انھوں نے اپنے ایک رسالے میں تحریر بھی فرمایا ہے جس کا نام ہے ''**کلمات فی رد اباطیل و افتراء ات**'' ان کے مخالفین صرف زبانی مخالفت پر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ سرکاری حلقوں تک مخبری کی اور ان کو ایذا پہنچائی، ان کے استاذ کے

خلاف ہرزہ سرائی کی گئی، طنز وتعریض ہوئی مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا جواب دیا بلکہ ان سے نسبت اور شاگردی پر نازاں رہے۔

علماء دیوبند سے ربط

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے مصر کے محققین علماء سے علم حاصل کیا اور وطن لوٹ آئے، پھر سعودی عرب میں مقیم ہوئے مگر ان اعلیٰ تعلیم کے بعد علمی تحقیق اور مختلف ملکوں کے علماء سے استفادے کا سلسلہ برابر جاری رکھا، برصغیر کے علماء ومحدثین سے بھی فیض حاصل کیا، خاص طور پر علمائے دیوبند سے حدیث کی خصوصی اجازت لی، ان میں نمایاں طور مولانا بدرعالم میرٹھی، علامہ محمد یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، (تلامذۂ علامہ انورشاہ کشمیری) اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمہم اللہ ہیں۔

شیخ کا علمائے برصغیر سے گہرا ربط تھا، بعض محدثین سے بے انتہا عقیدت، خاص طور پر مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھنوی، علامہ محمد انورشاہ کشمیری اور مولانا ظفر احمد عثمانی سے، ان حضرات کی کتابوں پر تحقیقی کام بھی کئے، ان پر تعلیقات لکھیں، اور شائع کرایا، چنانچہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی تصنیفات میں جن کی تعداد ستر (۷۰) کے قریب ہے، سرفہرست شیخ عبدالحئ لکھنوی کی ''**الرفع و التکمیل**''، مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی کی **"قواعد فی علوم الحدیث"** اور علامہ کشمیریؒ کی **"التصریح بما تواتر فی نزول المسیح"** کی تحقیق وتعلیق ہے، جن پر ان کی تعلیق کے ساتھ فوائد وحواشی ہیں، نہ صرف ان کتابوں پر تحقیقی کام ہی کیا بلکہ ان محدثین عظام کی تصنیفات اور ان کے علمی کارناموں کو عرب دنیا کے علمی حلقوں میں متعارف بھی کرایا۔ ان کی یہ خدمت بلاشبہ علمائے ہند کے لیے ایک عظیم کارنامہ ہے، وہ اپنی مجلسوں میں بھی کہا کرتے تھے کہ میں ہندوستان کے دو عالم کی کتابوں

اوران کی علمی صلاحیت سے بیحد متأثر ہوں، ایک مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اور دوسرے علامہ انورشاہ کشمیریؒ، کہا کرتے تھے کہ ان کے علوم وکتابوں پر مزید کام کرنے اور اسے عام کرنے کی ضرورت ہے، مولانا ظفر احمد عثمانی کی معرکۃ الآراء تصنیف **"اعلاء السنن"** جوبیس جلدوں پر عربی میں مشتمل ہے اس کے مقدمے کو **"قواعد فی علوم الحدیث"** کے نام سے شائع کیا، اسی میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"میرے شیخ مولانا عثمانی نے اس کتاب کی ترتیب میں اصول حدیث، اسماء الرجال، اصول فقہ، شرح احادیث اور تاریخ کی کتابوں کو کمال بصیرت سے کھنگالا، اوران میں سے جمع کردہ انمول موتیوں کو قواعد وضوابط کی علمی لڑی میں پرودیا، اور بڑے ہی نادر اور انوکھے اصول کی شکل میں پیش کیا جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان پر وہی بات صادق آتی ہے جو علامہ کشمیریؒ کے بارے میں کہی گئی ہے کہ ان کی تحقیقات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں علم کی ایسی پرنور مشعل ہے جسے وہ کتابوں کے خزانوں کی طرف پھیرتے ہیں اوران کی تہوں سے علم کے آبدار موتی اور ایسے علمی دلائل اور عبارتیں نکال لیتے ہیں جن کو دیکھ کر علماء اور محققین بھی حیران رہ جاتے ہیں۔"

امام بخاری کانفرنس تاشقند میں

توفیق الٰہی شامل حال ہو اور قسمت یاوری کرے تو منھ مانگی مراد مل جایا کرتی ہے بلکہ بن مانگے بھی سعادت حاصل ہوجاتی ہے، یہی صورتِ حال راقم الحروف کو بھی پیش آئی جب کہیں وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اسی عبقری شخصیت سے بلاواسطہ فیض حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا، مگر یہ شرف نہ صرف حاصل ہوا بلکہ مکمل ایک ہفتے تک شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نوراللہ مرقدہٗ کی صحبت اوران سے استفادے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ساتھ ہی علم حدیث میں اجازت بھی حاصل کی۔

سویت یونین کے خاتمے کے بعد اسلامی ریاستوں کو بھی آزادی ملی، جن میں

بلاد ماوراء النہر کے مشہور مراکزِ علوم سمرقند و بخاریٰ پر مشتمل ملک ''ازبیکستان'' کے نام سے منظر عام پر آیا جس کا دارالحکومت تاشقند ہے، ۱۹۹۳ء اکتوبر کے مہینے میں ''سمرقند'' میں ''الامام المحدث محمد بن اسماعیل البخاری'' کے عنوان سے کانفرنس منعقد ہوئی، دنیا بھر کے علماء، محدثین، فقہاء، سربراہان مملکت اس میں مدعو ہوئے۔

دراصل برطانیہ میں واقع ''آکسفورڈ سینٹر برائے اسلامک اسٹڈیز'' نے ازبیکستان حکومت کے تعاون سے ایک پروجیکٹ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے طے کیا، جس کے تحت امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاریؒ کی مسجد اور مدرسہ کی ازسرنوتعمیر وتوسیع کا منصوبہ بنایا گیا اور دنیا کے ماہر انجینئروں سے پروجیکٹ کا نقشہ مرتب کرنے کی فرمائش کی گئی، اسی مناسبت سے ۲۳/تا ۲۵/اکتوبر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر ایک عالمی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا، واضح ہو کہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ اعلیٰ دنیائے اسلام کے معروف عالم دین مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور اس کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر فرحان احمد نظامی تھے جو ہندوستان کی معروف علمی وتاریخی شخصیت پروفیسر خلیق احمد نظامی کے صاحبزادے ہیں۔

اس منصوبے کے نمائندہ نگراں حضرات میں جناب اسلام کریموف صدر جمہوریہ ازبکستان، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی مکہ، شیخ الازہر مصر، حضرت مولانا علی میاں ندوی اور ڈاکٹر یوسف القرضاوی جیسے افراد تھے۔

دنیا بھر کے معروف علمائے دین اور علم حدیث سے شغف رکھنے والے افراد کو دعوت دی گئی تھی، خود ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حضرت مولانا کے علاوہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی (موجودہ صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) مولانا محمد سلمان الحسینی اور حضرت مولانا ناصر علی شیخ الحدیث پر مشتمل وفد موجود تھا، دارالعلوم وقف دیوبند

سے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف، مولانا محمد سفیان قاسمی اور راقم الحروف مدعو تھے، ان کے علاوہ حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی اور دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری اور جمعیۃ علماء ہند کے سربراہ حضرت مولانا اسعدمدنی شامل تھے۔

پروگرام کے مطابق ہم چارافراد پر مشتمل قافلہ ۲۰/اکتوبر ۹۳ءکوتاشقند کے لیے روانہ ہوا، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی، حضرت قاضی صاحب، مولانا سفیان صاحب اوراحقر ایک ساتھ ہی روانہ ہوئے اور کانفرنس کے اختتام تک ہم ساتھ ہی رہے، بعد میں ہمارے ساتھ انگلینڈ سے آئے ڈاکٹر مناظر حسن صاحب شامل ہوئے اور ہم تقریباً ہر جگہ ساتھ ہی رہے۔ دس روز تک کا یہ علمی سفر ساتھ ہی گذرا۔

سب سے پہلے ہمارا قیام تاشقند کے مشہور پانچ ستارہ ہوٹل ''ازبیکستان'' میں رہا تا آنکہ تمام مدعوئین یہیں پہنچ گئے، اس لیے کہ اصل پروگرام تو ''سمرقند'' میں ہونا طے تھا جو تاشقند سے آدھے گھنٹے کی ہوائی مسافت پر واقع ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ رات کے کھانے کے لیے ہم اپنے کمروں سے نکل کر نیچے نشست گاہ میں بیٹھے تھے کہ اطلاع ملی سعودی عرب کے علماء کا وفد آ گیا ہے، ایک جگہ جمع ہوئے تو دیکھا حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی سربراہی میں ایک وفد پہنچا، ملاقات ہوئی اور تعارف ہوا، مختصر نشست تھی مگر وہی علمی مجلس بن گئی، کیوں کہ ایک عظیم علمی شخصیت کی موجودگی میں یہی ممکن تھا۔ اسی مجلس میں پاکستان کے جامعہ فاروقیہ کے مہتمم اعلیٰ حضرت مولانا سلیم اللہ صاحب، ان کے صاحبزادے مولانا محمد عادل صاحب اور جنوبی افریقہ کے جناب مولانا علی آدم ندوی بھی پہنچ گئے تھے، ہمارے میزبانوں میں مقامی افراد بھی موجود تھے، جو عربی زبان سے واقف تھے، وہی ہماری ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے تھے، ضمناً یہ ذکر کردینا بے محل نہیں ہوگا کہ وہاں کے

باشندے روسی اور مقامی زبان کے علاوہ تیسری زبان سے قطعی ناواقف تھے، چند افراد جو مہمانوں کے استقبال پر مامور تھے وہی صرف عربی زبان یا بعض افراد انگلش جانتے تھے، حیرت ہے کہ اتنے بڑے ہوٹل میں جہاں سیکڑوں کا عملہ ہو وہاں صرف ایک ہیڈ کلرک انگلش جانتا تھا۔

۲۱/ اکتوبر کو تمام موجود مہمانوں کو سمرقند پہنچایا گیا اور سبھوں کو ایک بڑے ہوٹل ''سمرقند ہوٹل'' میں ٹھہرایا گیا، مہمان آتے رہے اور سمرقند پہنچتے رہے، برونئ سے سات نفری وفد پہنچا جس میں وزیر تعلیم، دینی امور کے سکریٹری اور مفتئ اعظم بھی شامل تھے، ۲۲/ اکتوبر تک مدعوئین کی بڑی تعداد آ گئی تھی، مجموعی طور پر آنے والے مدعوئین ان ممالک سے آئے تھے: سعودی عرب، کویت، قطر، عرب امارات، الجزائر، عراق، مصر، ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، جرمنی، فرانس، ترکی، برونئ، ملیشیا، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ۔

۲۳/ اور ۲۴/ اکتوبر کو کانفرنس منعقد ہوئی، افتتاحی اور اختتامی پروگرام بڑے عظیم الشان ہوئے، تقریریں ہوئیں، مقالات پڑھے گئے، اختتامی پروگرام میں گورنر سمرقند بھی صدر جمہوریہ کے نمائندے کے طور پر شریک ہوئے اور انھوں نے تمام مدعوئین اور مقامی علماء و سیاسی حضرات کی رات کے کھانے میں دعوت کی جو کم و بیش ایک ہزار افراد پر مشتمل تھے اور ایک ساتھ ایک ہی ہال میں شریک ہوئے، چار گھنٹوں تک چلنے والی یہ دعوت بجائے خود ایک کانفرنس تھی جس میں مختلف افراد کے بیان اور سوال و جواب بھی جاری رہے۔

حضرت شیخ کی معیت، استفادہ اور اجازت حدیث

۲۰/ اکتوبر کو جب تاشقند پہنچے اور رات کے کھانے میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ سے ملاقات ہوئی اور اگلے ہی دن سمرقند میں قیام ایک ہی ہوٹل کی ایک ہی منزل

میں ہوا تو موقع غنیمت تھا کہ حضرت شیخ کے ساتھ زیادہ نشست ہو، ادھر حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی تھے جن کو ان بلادِ علم سے والہانہ عقیدت تھی، یہاں کے محدثین اور فقہاء کے مقامات، خدمات اور مقابر کی تفتیش شروع کردی تھی، وہ اپنے ساتھ ہندوستان سے بہت ساری کتابیں لے کر آئے تھے، ان میں درج معلومات کی روشنی میں تلاش وجستجو بڑھ گئی، ابھی کانفرنس منعقد ہونے میں دو دن باقی تھے، ادھر حضرت شیخ ابوغدہ کا یہی حال تھا، سب سے پہلے امام بخاریؒ کی جائے وفات پر جانے کا فیصلہ ہوا، ساتھ ہی ہم سب کی رائے ہوئی کہ حضرت شیخ کی سربراہی اور معیت میں ہی تاریخی مقامات کی زیارت ہوا کرے گی، شیخ بھی راضی تھے، اس لیے بعد نماز ظہر (۲۱/اکتوبر) سفر کا ارادہ ہوا، حسب ضابطہ منتظمین کو اس کی اطلاع کردی گئی، انھوں نے تیاریاں مکمل کردیں، ایک عمدہ ترین چھوٹی سی بس کا انتظام ہوا جس میں ہم پانچ افراد کے علاوہ حضرت شیخ، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد سلمان ابوغدہ اور ان کے رفیق وخادم جناب محمد آل الرشید اور چند دیگر مہمانان کرام تھے، چوں کہ کانفرنس میں مدعوئین حضرات کو حکومتی سطح پر اہم ترین (.V.V.I.P) درجہ حاصل تھا اس لیے بس سے آگے انتظامیہ اور پولیس کی ایک گاڑی اور اس کے پیچھے بھی ایک گاڑی، سفر شروع ہوا امام بخاریؒ کی آخری آرامگاہ خرتنگ نامی گاؤں کے لیے جو سمرقند سے تقریباً ۳۰ / کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، راستے میں محسوس ہوا کہ سویت یونین کے زمانے میں حکومت کے اہلکاروں کی کتنی اہمیت یا کتنا خوف ہوا کرتا تھا، اثرات وہی تھے، چنانچہ سامنے سے آنے والی گاڑیوں کو مؤدب ہوکر ہر جگہ رکتے ہوئے دیکھا، صرف اتنا ہی نہیں کہ ہمارے قافلے کو جانے کے لیے بآسانی راستہ دے دیا جاتا بلکہ دور تک جہاں پولیس والوں کی یہ گاڑی نظر آئی ہر سواری اپنی جگہ رکتی چلی گئی، بالآخر ہم اس گاؤں تک پہنچے تو ایک بورڈ لگا دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا ''ناحیۃ خواجہ اسماعیل البخاری'' معلوم ہوا کہ اب خرتنگ کا نام کتابوں

میں موجود ہے، حدیث کے اساتذہ اور طلبہ ہی اس نام سے واقف ہیں، ورنہ اس کا نام بدل دیا گیا ہے، کچھ پرانے لوگ وہاں کے اس نام سے کسی حد تک آشنا ہیں۔

مسجد امام بخاری سامنے تھی، دل عقیدت سے معمور، تاریخ ذہنوں میں گردش کرتی ہوئی، عروج و زوال کے سارے مناظر گویا آنکھوں کے سامنے، مسجد کے اندر اور باہر صحن میں عمدہ نئی قالینیں بچھادی گئی تھیں، صحن سے گذر کر امام بخاری کے مزار تک پہنچے، فاتحہ پڑھی، ایصال ثواب کیا اور نماز عصر کی تیاری ہوئی، نماز کے بعد مسجد ہی میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے عربی میں تقریر فرمائی جس سے ہم سب سامعین مستفید ہوئے، مسجد کے برابر ہی میں گاؤں کے بزرگوں نے چائے کا اہتمام کیا تھا، وہاں کی چائے کا مطلب ہے گرم پانی میں چائے کی پتی، دودھ اور شکر سے بے نیاز، وہاں عام رواج یہی ہے، اگر کسی کو چینی اور دودھ درکار ہے تو وہ ہر وقت اپنے ہمراہ رکھے، ہمارے قافلے کے ساتھ آئندہ یہی ہوتا رہا کہ ہم ہر مجلس میں چینی اور دودھ کا ڈبہ (سیّال دودھ) ساتھ رکھتے تھے۔

مغرب سے پہلے وہاں سے واپسی ہوئی اور سمرقند کے قریب ''زُمراد'' والی مسجد میں باجماعت نماز ادا کی، امام وہیں کے تھے، کچھ دیر وہاں امام صاحب سے عربی میں گفتگو رہی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب وہاں مسجدیں کافی حد تک واگذار ہو چکی ہیں جہاں امام ومؤذن مقیم ہوتے ہیں اور جہاں پر بھی مسجدیں ہیں ہر جگہ ایک بڑا رقبہ زمین کا مسجد کے لیے مختص۔ ساتھ میں مہمان خانہ لازمی، کھلا صحن، وسیع میدان جس میں ہرے بھرے درخت، پھولوں کی بیلیں ضرور ہوتی ہیں۔

اور اہل علم واقف ہوں گے کہ جب امام المحدثین کو بخارا سے جلاوطن کا فرمان ملا، تو اہل سمرقند نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اور تمام مسلمان ہر روز امام بخاری کے انتظار میں باہر آکر اپنی نظریں فرشِ راہ کرتے رہے۔ حضرت الامام

جب سمرقند کے لیے روانہ ہوئے تو سب سے پہلے اپنے نانیہال (خرتنگ) میں قیام پذیر ہوئے، سمرقند والوں کو اطلاع تھی اور وہ سب امام حدیث کے منتظر، امام بخاری نے اسی گاؤں میں سمرقند روانگی سے پہلے ہی دعا فرمائی تھی **"اللھم ضاقت بی الارض بما رحبت"** دعا قبول ہوگئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی مقام کو ان کی آخری آرامگاہ کے لیے منتخب کرلیا اور اپنی جوار رحمت میں جگہ دے دی۔

●●●

۲۲/اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا، حضرت شیخ ابوغدہ کی سربراہی میں بعض تاریخی مقامات کی سیر کی، ''الغ بیگ کا میوزیم'' اور ''ریگستان''، دراصل ریگستان ایک مخصوص جگہ تھی جہاں بڑی بڑی تاریخی عمارتیں موجود ہیں، جہاں کبھی دینی علوم کے مراکز ہوا کرتے تھے، معائنہ کے وقت اثرات ظاہر ہوتے رہے۔ جمعہ حضرت عبیداللہ احرار کی مسجد میں ادا کیا، پھر واپس ہوٹل آگئے، کھانے سے فراغت کے بعد آرام کی بجائے سمرقند کے دوسرے نواحی تاریخی مقامات کی زیارت کے لیے تیار ہوئے، حضرت شیخ ہمراہ تھے اور وہاں کے علماء اصولیین، فقہاء وغیرہ کے حالات وخدمات سے واقف کراتے رہے، سب سے پہلے سمرقند کے مضافات میں فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کے مزار پر حاضری ہوئی، وہیں مسجد ہے، عصر کا وقت ہوگیا تھا تو حضرت شیخ کے عالم دین صاحبزادے محمد سلمان ابوغدہ نے اذان دی، نماز کے بعد کچھ معمر بزرگ بیٹھ گئے اور ہمیں ترجمان کے واسطے سے اپنے گذشتہ تکلیف دہ حالات کے بارے میں بتانے لگے۔ حضرت شیخ نے دعا کرائی، پھر قریب ہی ابومنصور ماتریدی کے مزار پر بھی حاضری ہوئی۔ پھر مغرب سے پہلے ایک معروف مقام ''شاہ زنداں'' پہنچے جہاں روایت کے مطابق صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت قثم بن عباس برادر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مدفون ہیں،

دعاؤں سے فراغت کے بعد مغرب کی نماز پڑھی اور واپس قیامگاہ پہنچے۔

اگلے دو دن کانفرنس کی کارروائیاں ہوئیں، ایک نشست کی صدارت بھی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق تھی جس میں انھوں نے ایک بلیغ خطبہ بھی عربی زبان میں دیا۔

۲۴/تاریخ کی رات ہی سے تاشقند کے لیے مہمانوں کی واپسی شروع ہوگئی، ۲۵/تک سب ہی مہمان واپس اسی ''ازبکستان'' ہوٹل میں آکر مقیم ہوگئے، متعینہ واپسی کی تاریخ اور ٹکٹ کے حساب سے مہمانان اپنے وطن کو روانہ ہونے لگے۔

ہم چار لوگوں کا واپسی کا ٹکٹ ۲۹/اکتوبر کا تھا، اور حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور ان کے رفقاء ۲۷/کو واپس جانے والے تھے، اس لیے حضرت شیخ سے استفادے کا وافر موقع مل گیا، حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نے فرمایا کہ اچھا موقع ہے حضرت شیخ سے باضابطہ حدیث پڑھ کر اجازت حدیث حاصل کرلی جائے، چنانچہ ہم دونوں حضرتؒ کی خدمت میں پہنچے اور مدّعا ظاہر کیا، شیخ نے بڑی خوش دلی کے ساتھ درس دیا اور اپنی سند بیان کرکے اجازت حدیث عنایت فرمائی، دعاؤں کا تحفہ مزید حاصل ہوا۔

ان فرصت کے ایام میں ہم تاشقند کے مختلف مقامات بھی گئے، تاریخی عمارتیں بھی دیکھیں، مدارس دینیہ بھی پہنچے، وہاں چونکہ سب حنفی المسلک آبادی ہے اس لیے نصابی کتابوں میں حنفی المسلک فقہ واصول فقہ کی قدیم کتابیں شامل تھیں۔

مگر سب سے اہم اور یادگار سفر حضرت شیخ کی سربراہی میں ''زرقینا راسٹریٹ'' کا ہوا، انتظامیہ نے ہر ہر جگہ سہولتیں فراہم کیں، ہر قیام پر خصوصی ہدایات پہلے سے موجود تھیں، اس علاقے میں ''ادارہ دینیہ برائے وسطی ایشیا'' کا مرکز ہے، وہاں کے بعض علماء سے ملاقاتیں ہوئیں جو عربی زبان پر قادر تھے اور براہ راست تمام

تفصیلات بتاتے تھے، لائبریری اور مخطوطات کا بڑا ذخیرہ بھی دیکھا، پھر ہم اس بند دروازے پر پہنچے جس کے اندر مقدس مصحف عثمانی موجود ہے، حضرت شیخ کی بدولت ہمیں اندر جانے کی میں بھی سہولت ہوئی اور اس مقدس قرآن کریم کے نسخے کی زیارت نصیب ہوئی جس کے بارے میں مستند اور صحیح روایت ہے کہ یہ وہ نسخہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ملک شام ارسال فرمایا تھا۔ بڑی حفاظت کے ساتھ شیشے کے ایسے صندوق میں رکھا ہوا ہے جس میں قرآن کھلا ہوا ہے اور دو صفحے مکمل نظر آرہے ہیں، بابرکت نسخہ جو خط کوفی میں تحریر ہے اور اعراب و نقطے سے خالی ہے۔

۲۷/اکتوبر کو ہم سب ائیر پورٹ پہنچے، مگر ہمیں جگہ نہیں ملی، حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور ان کے رفقاء کو رخصت کیا، دعائیں لیں۔

وطن واپسی کے بعد ایک دفعہ محترم محمد سلمان ابوغدہ سے خط و کتابت ہوئی اور ٹیلیفون پر حضرت سے گفتگو بھی ہوئی، حضرت سے رابطے کا یہ آخری موقع تھا۔

۱۹۹۷ء میں استاذ و شیخ حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا انتقال ہوا اور سعودی عرب ہی میں مدفون ہوئے۔ میں نے بذریعۂ خط ڈاکٹر محمد سلمان ابوغدہ سے تعزیت کی۔